خراب ہوگئی تھی۔ ابا کہہ رہا تھا "نمازیوں کا تو خدا ہی ناراض کر دیا اس نے۔۔" بچے نے پھر اپنے ابے کی نقل کی۔

"دیکھ مٹھو کسی کا خدا خراب نہیں ہوتا، کتنے بھلے کئے ہیں بلو رانی نے سب کے۔۔ کیا سب بھول گئے؟ ۔۔۔ راحت کی آواز میں ویسی ہی جانی پہچانی تلخی گھل گئی جیسے شروع شروع میں وہ ثاقب کے سامنے اپنے فائدے گنواتی تھی تو اس کے لہجے میں آ جاتی تھی۔

" آپا ابھی سب اکٹھے ہونے لگے ہیں تو آپ خود ہی سن لینا، میں تو چلا ابھی ککو نے دس سکور کئے ہیں، میں نے اسے گیارہ کر کے ہرا دینا ہے" ۔ بچہ کہتے ہوئے بھاگنے لگا تو راحت نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑ لیا:

"بات سن، مٹھو تجھے یاد ہے نا، بلو رانی تمھارا گیند کہاں کہاں سے پکڑ کے لاتی تھی۔۔ ایک دفعہ تمھارا گیند چوہدری صاحب کی گلاب کی جھاڑی میں پھنس گیا تھا، کانٹے چبھنے اور کیڑوں کے ڈر سے کوئی بچہ اس گھنی جھاڑی میں نہیں جا رہا تھا، کون گیند لایا تھا؟ کچھ یاد ہے؟ مٹھو سر جھکائے کھڑا رہا جیسے پنچائیت کے فیصلوں کا ذمہ دار وہ بھی ہوگا۔

"بلو رانی نکال کے لائی تھی اور سارا پنجہ اس کا زخمی ہو گیا تھا، یاد ہے کہ نہیں؟ راحت نے مٹھو کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کیا۔۔

"ہاں آپا تب بڑے کام کی تھی۔ مگر اب تو۔۔۔۔" مٹھو نے راحت سے آنکھیں چراتے ہوئے کمزور سی آواز میں کہا۔

"مٹھو وہ کام کی نہیں رہ گئی مگر جو اچھے اور مشکل کام اس نے سب کے لئے کئے ہیں وہ تو کوئی یاد رکھ لے۔ اور مٹھو کوئی یہ بھی تو سوچے کہ وہ کام کی کیوں نہیں رہ گئی؟ اسے کیا روگ لگ گیا ہے؟ ۔ ابے سے کہنا یہ باتیں بھی پنچائیت میں کرے، شائد پھر بلو رانی کو زہر نہ دیں۔۔ شائد۔۔۔۔ کہے گا اپنے ابے سے؟ راحت نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے

کہا۔۔ کہے گا؟"

"اچھا آپا جی۔۔ ویسے روگ کیا؟ ابا کہہ رہا تھا ڈحرام ہوگئی ہے اور بس, روگ کیا آپا جی؟

راحت خاموشی سے مٹھو کو دیکھتی رہی، اس کی نظروں سے گھبرا کر وہ بول اٹھا۔۔ اچھا! کہہ دوں گا۔۔

مٹھو چلا گیا اور وہ وہیں کھڑی رہ گئی اور پھر اچانک رات کو ثاقب سے ہونے والی لڑائی کا منظر ایک دم سے آنکھوں میں چھم کر کے اتر آیا,

"تم سے تو بات کرنا مشکل ہو گیا ہے، جب سے اماں دنیا سے گئی ہیں، تیری تو زبان ہی باہر آ گئی ہے۔" ثاقب نے غصے سے گلاس زمین پر دے مارا تھا۔

"یہی میں کہہ رہی ہوں جب سے اماں دنیا سے گئی ہے آپ کا گھر آنے جانے کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں رہا، دیر سے آتے ہیں اور آ کر بھی جیسے نہیں آتے، ٹی وی لگا لیتے ہیں اور میں سارا دن بچوں کے ساتھ لگی رہتی ہوں، میرا بھی دل کرتا ہے کوئی مجھ سے بات کرے۔ میرا حال پوچھے۔" رات بہت دنوں بعد اس نے ہمت کر کے پھر سے اپنے لئے کوئی آواز اٹھائی تھی مگر نتیجہ وہی نکلا،

"ہوگئی شروع پھر سے مظلومیت کی کہانی۔۔ بات سنو! گھر کے کاموں کے لئے چھیمو ہے، ایک بچوں کو ہی دیکھنا ہوتا ہے نا، اس کی بھی شکائت کر رہی ہو؟۔۔ اور کیا چاہیئے تمھیں ناشکری عورت۔۔ خوش رہنا نہیں آتا؟ تم جیسی کم ظرف عورتیں کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔۔ بس کوئی نہ کوئی رونا"۔۔۔

"میں بچوں کے خیال رکھنے کی شکایت نہیں لگا رہی میں تو کہہ رہی ہوں میں۔۔۔"

"بس!! چُپ.. ایک آواز نہ نکلے، تھکا ہارا انسان گھر آتا ہے، سکون کے لئے، وہ تو تم

سے اب ملتا نہیں ،تو کم از کم زبان ہی منہ کے اندر رکھنی سیکھ لو، کچھ تو احسانوں کا بدلہ دے دو۔۔۔"

احسان کا لفظ سن کر راحت کا حساس دل ٹوٹ سا گیا اور اس نے سوچا اسے چپ ہی رہنا چاہیئے تھا کیونکہ اب وہ آرام سے بھی بات پوچھنے کا حق کھو بیٹھی تھی ، سنا نہیں تھا شوہر کیا کہہ رہا تھا کہ اب وہ سکون بھی نہیں دے سکتی اور جب بیوی سکون دینے کے قابل نہ رہ جائے تو کچھ بھی پوچھنے کا اختیار کھو بیٹھتی ہے یہ بات اسے پہلے سمجھ نہیں آ رہی تھی ، اب وہ سمجھ چکی تھی ۔ جب ثاقب ضد کر کے اب اس سے کچھ نہیں منواتا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے تو اسے بھی صبر شکر کر کے خاموشی سے اِسی زندگی میں خوشی ڈھونڈ لینی چاہیئے ۔

"بڑی ہی ناشکری ہوں میں"۔۔ثاقب ٹھیک کرتا ہے، میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی گالیاں دینی شروع کر دیتا ہے, میں اب اس کے کس کام کی؟

"میں نے تو۔۔۔۔۔۔۔۔راحت نے بات کو ختم کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں ہی ٹوٹ گئے کیونکہ ثاقب غصے سے اسے دھکا مارتا ہوا باہر جا کر صوفے پر لیٹ گیا تھا۔

کچھ روز پہلے اسے اپنے ناشکرے پن کی آخری گواہی بھی مل گئی تھی جب ہر طرف سے دروازے بند ہو گئے تو اس نے اپنی بڑی بہن کو اپنے کرب میں شریک کرنے کی کوشش کی تھی ۔۔"باجی پتہ نہیں ثاقب کو کیا ہو گیا ، پہلے بات سنتا نہیں تھا ، اب کرنے بھی نہیں دیتا۔۔۔میں کیا کروں"؟

"شاباشے یہ کون سی ایسی بات ہے؟ خالہ صغریٰ کی لڑکی یاد ہے، اس کا شوہر جوئے میں سب لٹا بیٹھا تھا، در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے، اپنے محلے کی کلثوم یاد ہے؟ جس کا شوہر ہر ہفتے کی رات شراب پی کر اس کی پٹائی لگاتا تھا؟ اور میرا حال پتہ ہے نا؟ کتنا گندا

سسرال ملا ہوا ہے، بات بات پر روک ٹوک ہے مجھے ۔۔تجھے کیا ہے؟ سب کچھ تو ہے تمھارے پاس۔۔عیش کر رہی ہو عیش، پھر بھی ناشکری، بس تمھیں تو رونے دھونے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں"۔اس کی بہن نے بات پوری سنے بغیر اسے لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔۔

" مگر میں نے تو آج زندگی میں پہلی دفعہ آپ سے کوئی ایسی بات کی ہے، میں نے کب شکوے کیئے ہیں"۔۔۔اس نے حیران ہو کے پوچھا تھا۔

ابا کو نہیں بتاتی رہتی کہ وہ کچھ سمجھتا نہیں ،مشورہ نہیں کرتا ، بتاتا نہیں ، تیرا کیا خیال ہے ابا ہمیں نہیں بتاتے؟ تیرے جانے کے بعد ابا بھی یہی کہتے ہیں کہ اس لڑکی کو بی اے کیا کروا دیا، اسے تو خوش رہنا ہی بھول گیا۔۔"

"یہ ابا کہتے ہیں؟ اس نے بے یقینی سے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں, میں اپنے پاس سے لگا رہی ہوں , ابا ہی کہتے ہیں اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں، بس اب میرا منہ نہ کھلوا اور بلا وجہ کا مظلوم بننا چھوڑ دو اور خوش رہنا سیکھو، دال میں ہر وقت کالا کالا نہ دیکھا کرو۔ ابا کو میرے مسائل حل کرنے دو جو واقعی بڑے سنگین ہیں، اپنی فضول کی اور بے کار کی باتوں میں انہیں مت الجھائے رکھا کرو، اور خدا کے واسطے شکر کرنا سیکھو۔۔" بہن نے آواز میں تھوڑی سی نرمی بڑی مشکل سے شامل کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بہت خوش ہوں باجی شکر ہے اللہ کا میں تو بس یونہی ایک بات۔۔ ۔"۔اب وہ دروازے کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی ناحق اپنے الفاظ باجی پر ضائع کیے تھے۔کوئی دکھ نہ سمجھے تو یہ اس بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔انسان کو سمجھنے کے سب دروازے بند ہو جائیں، تو وہ احتجاج کرنا چھوڑ دیتا ہے۔احتجاج کرنا چھوڑ دے تو کیسی سستی جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

"یہ بلو رانی بڑی ہی ہڈ حرام ہو گئی ہے، محلے میں چوریاں ہونا شروع ہو گئی ہیں کیا

فائدہ اس کم بخت کا"۔۔سامنے کی گراؤنڈ میں پنچائیت بیٹھ چکی تھی اور شیخ صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔۔

"پندرہ لوگوں کی چائے بنا کر بھجوا دینا۔۔اسی وقت ثاقب نے اندر آ کر اسے کہا اور تم کیا دروازے کے ساتھ چمٹی کھڑی ہو؟

"وہ بلو رانی کو کیا کریں گے؟ اس نے ثاقب کی جھڑک کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بلو رانی کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے آج اور کیا ہونا ہے؟ ثاقب تھوڑا نرمی سے بولا۔

اس کی نرمی کو دیکھتے ہوئے وہ جھٹ سے بولی:

" آپ جو بھی بات کریں یاد رکھیں کہ وہ بہت بڑے دکھ سے گذری ہے۔میونسپل والے جب تک اس کے بچے اٹھا نہیں لے گئے تھے وہ بڑی وفاداری اور محبت سے سب کا خیال رکھتی رہی ہے۔۔یاد رکھئے گا یہ۔۔۔خیال رکھئے گا کوئی نا انصافی، کوئی ظلم نہ ہوجائے۔۔۔"الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے اور ثاقب حسبِ معمول اس کی بات سنے بغیر دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔۔۔

"یاد رکھئے گا ۔۔۔۔وہ بہت وفادار اور محبت کرنے والی تھی ۔۔۔ وہ، وہ ۔۔۔۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔جیسے وہ ثاقب کے ساتھ پہلے کی طرح اپنے لئے بحث کرتی تھی اور وہ ایسے ہی اس کی بات سنے بغیر یا سوجاتا تھا یا کمرے سے نکل جاتا تھا۔۔وہی شناسا سا آنسو کا گولہ گلے میں آ ٹکا۔۔

ادھر بلو رانی کا مقدمہ جاری تھا۔وکیل صاحب نے دفتر سے آ کر اپنا کالا کوٹ بھی نہیں اتارا تھا کیونکہ باقی محلے کے لوگ ان کی بات کو کالے کوٹ کی وجہ سے زیادہ اہمیت

دیتے تھے۔شیخ صاحب کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انتہائی غصے سے بول پڑے:

محلے میں چوریاں ہو رہی ہیں، یہ ہڈ حرام منہ بسورے پڑی رہتی ہے، بلاؤ تو آگے سے بھونکتی ہے، سزا کے طور پر سب گھروں نے گوشت بند کیا تو قصائی کے پھٹے کے نیچے جا گھستی ہے، اس کے گاہکوں پر بھونک کر اس کی بھی گاہکی خراب کرتی ہے، اس نے بھگایا تو غضب خدا کا مولوی صاحب کی ٹانگ کو کاٹ کھایا۔۔"

"مولوی صاحب کی؟ استغفراللہ"۔۔حیرت سے بھری بہت سی آوازیں منمنانے لگیں۔۔

شیخ صاحب کے گھر کی چوری کا تو سب کو پتہ تھا مگر شائد یہ مولوی صاحب والا حادثہ حال ہی میں ہوا تھا اور کسی کو نہیں پتہ تھا۔۔۔

اب دکاندار وکیل صاحب کے خاموش ہوتے ہی بولا:

"ایسی احسان فراموش اور ناشکری نکلی اس کے لئے سب کے گھروں کے دروازے کھلے تھے، کسی نے اسے گلی کا آوارہ جانور نہیں سمجھا۔۔سب گھر کا پکا ہوا گوشت اسے دیتے تھے، اپنے بچوں کا دودھ اس کے لئے بھی رکھا جاتا تھا۔کیا کیا چاہ نہیں کئے۔۔گلی کے دوسرے آوارہ کتوں کی بجائے، محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔۔اتنی عزت ملی ہوئی تھی لیکن بڑے بوڑھے درست فرماتے ہیں کہ عزت اور خوشی ہلکی ذات کو راس نہیں۔۔آخر کو ذات کی کتیا ہی ہے نا۔یہی کرنا تھا اس نے۔۔کاٹ کھایا مولوی صاحب کو۔۔۔"

"ہائے او ربا مولوی صاحب کو کاٹنے والا جرم بہت بڑا۔ اب نہ بچی بلو رانی "راحت کے دل کو دھکے سے لگ رہے تھے۔

بلو رانی کے گلے میں پڑے پٹے کے ساتھ ایک لمبی سی رسی جوڑ کر اس کا دوسرا سرا اسی میدان میں ایک ٹنڈ منڈ درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔تا کہ وہ ادھر اُدھر نہ بھاگے

اور اپنے کیس کی سماعت اور فیصلہ پوری یکسوئی سے سنے۔

راحت بلو رانی کو اس حال میں دیکھ کر جیسے اپنے ہی حواس کھو رہی تھی اور بلو رانی مقدمے سے ایسے لاتعلق سی بیٹھی تھی جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ کیا ہونے والا ہے، جیسے اسے کسی سے بھی اچھائی کی امید باقی نہ رہ گئی ہو، جیسے اس کی سب امیدیں سب لوگوں سے ختم ہو چکی ہوں او وہ بس خاموش سی بیٹھی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی جب سے اس کے نومولود کتوروں کو میونسپلٹی کا ٹرک اٹھا لے گیا تھا اس دن کے بعد سے بلو رانی کی گردن اور آنکھیں بس تیز تیز ادھر اُدھر گھومتی رہتی تھیں۔۔

راحت کی آنکھوں میں اس صبح کا منظر آ کر بیٹھ گیا جب بلو رانی کی فلک شگاف چیخوں سے پورا محلہ جاگ گیا تھا۔ پتہ چلا کہ رات کے کسی پہر میونسپلٹی والے اس کے بچوں کو ٹرک میں لاد کر لے گئے تھے۔ بلو رانی ذرا پرے ہٹ کر سوئی ہوئی تھی، اٹھی تو اس کی دنیا لٹ چکی تھی۔ بلو رانی بچ گئی تھی مگر راحت اپنی ڈیوڑھی میں دروازے کے پیچھے کھڑی بلو رانی کی گمشدگی کے ایک ایک مرحلے کو یاد کر رہی تھی،

پہلے سب کو لگا جیسے بلو رانی کی مت ماری گئی ہے کیونکہ اب وہ کبھی وکیل صاحب کا کالا کوٹ پکڑ کر انہیں تکتی رہتی تھی، کبھی مولوی صاحب کے پاک سفید جبے کو منہ میں دبا لیتی تھی، سوچتی محلے کے یہ معززین اس کے بچے واپس دلا دیں گے مگر جب وہ اس کی خاموش آنکھوں کا مطلب سمجھے بغیر اسے جھٹک کر اپنے کاموں کاجوں کو چلے جاتے، تو بلو رانی کو لگا کہ دکھ شائد بول کر کہنے پڑتے ہیں، خامشی کو کوئی نہیں سمجھتا، تو وہ جو بڑی سمجھدار مشہور تھی، سوائے فقیروں اور چوروں کے کسی پر نہ بھونکتی تھی، اب آتے جاتے محلے والوں پر بھونکنے لگی تھی۔ راحت کو یاد تھا کہ اسے بھونکنے سے چپ کروانے کے لئے کبھی کوئی لات اور کبھی کوئی پتھر مار دیتا تھا۔ اُسے چوٹ لگتی تو وہ اور کربناک طریقے سے چیختی تھی ۔۔

بہت عرصے تک اس کی چیخوں میں کرب شامل رہا مگر پھر چوٹیں کھا کھا کے اس کی چیخوں میں تشدد کا عنصر آ گیا۔

پڑھے لکھوں کے اس محلے میں بلو رانی کے دکھ کے سب ان پڑھ رہے پہلے وہ اپنے دفاع میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بھاگ جاتی تھی، اب وہ اپنے دفاع میں حملہ کرنے لگ گئی تھی اور اب محلے والے اس سے خوفزدہ رہنے لگ گئے تھے او پھر جب اسے مڑ کر حملہ بھی کرتے دیکھا تو پتھر اور لات سے بھی پرہیز کرنے لگ گئے۔

پھر راحت کو یاد تھا کیسے محلے میں چوریاں بڑھنے لگ گئی تھیں مگر بلو رانی سب سے بے پرواہ، سست سی، ایک کونے میں پڑی رہتی تھی لیکن جس کے بھی گھر چوری ہوتی وہی اس کو گالیاں دیتا تھا اور سزا کے طور پر اس کا کھانا بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ محلے والے اس کی وفاداری، محبت، سمجھداری سب بھول گئے تھے، اب ہر کسی کو بلو رانی کی برائیاں نظر آ رہی تھیں اور اس پر کی گئیں اپنی اچھائیاں بہت بڑی ہو ہو کے نظر آنے لگی تھیں اور گذرتے دنوں کے ساتھ بلو رانی کے اندر اس کے کھوئے ہوئے بچوں کا دکھ ٹھہر سا گیا تھا۔

جرم تو اس کے بہت بڑے تھے۔۔ ناشکری کا، مت ماری جانے کا، کسی کام کی نہ رہنے کا اور پھر ہر وقت ناحق بھونکتے رہنے کا۔۔

راحت نے مٹھو کے ابے کی طرف دیکھا شائد مٹھو کے کہنے پر وہی بلو رانی کے احسانات یاد کروا دے مگر شائد مٹھو بھی اپنے ابے کو بتانا بھول گیا تھا۔۔ اس لئے کرسیوں سے صرف وہ احسانات یاد کروانے کی آوزیں ابھر رہی تھیں جو اس کتیا پر انسانوں کے تھے
۔

چھوٹے بیٹے کے رونے کی آواز سن کر اسے، فیصلہ سننے سے پہلے ہی دروازے سے کان ہٹانے پڑ گئے۔۔

ثاقب کمرے میں داخل ہوا تو چھوٹا تو دوبارہ سے سو چکا تھا مگر وہ نینداور رونے کی وجہ سے سرخ ہوئی آنکھوں کے ساتھ ثاقب کا ہی انتظار کر رہی تھی ۔۔" کیا ہوا فیصلہ؟ اس نے مردہ سی آواز سے پوچھا۔۔بلورانی کو زہر تو نہیں ۔۔۔۔۔۔؟"

"نہیں بابا اتنا سنگدل کون ہوتا ہے۔۔فی الحال یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جتنا بھی بھونکے، بس اس کو توجہ ہی نہ دو۔مولوی صاحب کو پیٹ میں چودہ ٹیکے لگے ہیں مگر پھر بھی انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ بلورانی کو اتنا کھانا جتنا زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے ڈالتے رہیں، ہوسکتا ہے وقت گذرنے کے ساتھ اپنا دکھ بھول کر نارمل ہو جائے اور پہلے کی طرح فائدہ مند ہوجائے ۔۔ چھ، آٹھ مہینے دیکھیں گے اس کے بعد بھی ٹھیک نہ ہوئی تو پھر دیکھا جائے گا۔۔۔"

"بڑی رحم دلی کی سب نے" ۔۔نہ چاہتے ہوئے بھی راحت کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔۔۔

"وکیل صاحب نے کہا ہے کہ انتہائی قدم لینے کی کیا ضرورت ہے، نکمی، کم عقل اور چڑچڑی کتیا ذات سب کی توجہ کی ایسی عادی ہو چکی ہے جب وہی نہیں ملے گی تو خود ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ ناشکراپن کرنے اور وقت بے وقت بھونکنے والوں کا یہی علاج ہوتا ہے، پڑا رہنے دو کم بخت کو کونے کھدرے میں، انہوں نے کہا ہے کہ بھونکے تو جواب میں پتھر نہ مارو، اور اس طرف دیکھنا بھی چھوڑ دو جدھر کم بخت پڑی ہو، ایسے سانپ بھی مرجاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی اور شُکر ہے سب محلے والوں نے اس فیصلے سے اتفاق کر لیا۔"

ثاقب نے الفاظ چبا چبا کر ایسے فخر اور اطمینان سے ادا کئے کہ جیسے اُس کے کئے گئے کسی سابقہ فیصلے پر محلے کے معززین نے بھی رضامندی کی مہر ثبت کر دی ہو۔۔۔۔

وہ دردیں

سال پہلے وہ درد اس کے پیٹ کے نیچے والے حصے میں اترا تھا تو اس کے لئے اجنبی تھا، آج وہ اسے اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔وہ جانتی تھی کہ یہ درد دنیا کا سب بڑا درد ہے، جب آتا ہے تو لگتا ہے جان ساتھ لے کر ہی جائے گا مگر جب جاتا ہے تو ایک ننھی سی جان آپکی گود میں ڈال کر آپ کو دنیا کا سب سے بڑا تخلیق کار بنا جاتا ہے۔مگر درد سے یہ آشنائی اسے پچھلے سال سے زیادہ خوفزدہ کر رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت وہ اس درد سے کبھی نہیں گزری تھی، اور نڈر تھی۔اسکی ماں کئی سال پہلے ہی اسے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ماں کے محبت بھرے ساتھ کی وجہ سے جو لڑکیوں کے اندر بڑے سے بڑا درد سہنے کی طاقت موجود رہتی ہے، وہ اس سے محروم تھی۔ اور ماؤں کی حفاظتی فطرت کی وجہ سے جو لڑکیوں میں نزاکت ہوتی ہے وہ اس سے بھی محروم تھی۔ اس کی زندگی میں ممتا کی عدم موجودگی نے جو غصے میں بھری مضبوطی اسے عطا کی ہوئی تھی وہی اس کے کام آتی تھی۔

مگر اب کے برس بات دوسری تھی۔سال پہلے والا بچہ اب اسکے کلیجے کا ٹکڑا بن چکا تھا۔موت جو اس کی سہیلی تھی، جس سے وہ گھنٹوں باتیں کرتی تھی اب اس کے پاس سے بھی گذر جاتی تو وہ پہروں کانپتی رہتی تھی۔ننھے سے بیٹے میں اس کی جان اٹک کے رہ گئی تھی۔ وہ ہنستا تو وہ ہنستی، وہ روتا تو وہ بھی رونے لگ جاتی تھی۔دیکھنے والے مذاق اڑاتے کہ بچے تو روتے ہی رہتے ہیں کوئی ان کے رونے سے ایسے بھی روتا ہے۔مگر وہ ایسے ہی روتی تھی، اس کا بیٹا اس کی زندگی کا پیار بھی تھا، اور زندگی سے پیار کرنے کی وجہ بھی۔

آج سال بھر کے بعد ہی جب وہ دوبارہ اسی درد سے گزر رہی تھی، تو کانپ رہی تھی۔ نو مہینے پورے ہونے سے پہلے ہی اس کا بچہ پیدا ہو جاتا تھا۔ پہلے بچے کی دفعہ بھی جب اس کی پڑوسن نے اسے پیٹ پکڑے درد سے دوہرا ہوتے دیکھا تو کہا تھا "ہسپتال جاؤ تمھارا بچہ ہونے والا ہے" اس وقت کے انتظار میں نجانے وہ کب سے ایک ایک دن گن رہی تھی۔ مگر ڈاکٹر نے تو صبح ہی اسے بتایا تھا کہ ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ تو اس نے پڑوسن سے بھی کہا تھا کہ "ابھی وقت ہے"۔

لیکن اس کی پڑوسن نے اسے ضد کر کے ہسپتال بھجوا دیا تھا۔ پہلے بچے کی خوشی اس پر ایسے طاری تھی کہ اسے آنیوالے وقت سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ تو وہاں ہسپتال میں کسی عورت کو اس دردِ زہ سے چیختے چلاتے دیکھتی تو اس کی ہنسی نکل جاتی تھی۔ اور چیخیں مارتی عورتوں کو دیکھ کر اس نے دل دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ دردیں جتنی بھی تیز ہو جائیں وہ ہرگز نہ چیخے گی۔

اسے اندازہ تھا کہ سال پہلے کئے گئے عزم کو نبھانا آج کس قدر مشکل لگ رہا ہے۔ وہ مخصوص درد پسلیوں میں جب تک رہتا ہے عورت نہ جیتی ہے نہ مرتی ہے۔ کہا جاتا ہے قبر کا منہ بھی کھل جاتا ہے اگر اس لمحے کوئی عورت سے پوچھ لے قبر کا منہ کھلا ہے وہاں تک چلنا پسند کریں گی یا یہی درددیں سہیں گی تو ہر عورت بلا جھجک قبر کا انتخاب کرے گی۔۔ مگر وہ بے درد دردیں اس وقت تک جان نہیں چھوڑتیں جب تک بچہ پلیسنٹا میں پلسیٹا مارے بیٹھا رہتا ہے۔ ادھر بچے اور ماں کا ناڑو کٹا ادھر وہ بھی جھٹ سے غائب۔۔

جولائی کے اس حبس زدہ موسم میں پرائیویٹ ہسپتال کا پرسکون اور ٹھنڈا ماحول اسے سکون نہیں پہنچا رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئی محلے کی ایک خالہ بار بار اس کے پسینے میں ڈوبے ہوئے ماتھے کو اپنے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے سفید تولیے کے ساتھ صاف کرتی تھی، جو انہوں نے ہسپتال آتے ہوئے، جب ان کی گاڑی لال بتی پر کھڑی تھی تو ایک

چھوٹے سے بچے سے ازراہِ ہمدردی لے لیا تھا، جو سگنل پر کھڑی گاڑیوں کے پاس بھاگ بھاگ کر جاتا تھا، اس نے درد کے وقفے میں سوچا تھا، ہائے یہ بچہ ایک تولیہ بیچنے کے لیے بھاگ رہا ہے، تو اس نے اپنے شوہر کو کہا تھا کہ "جلدی سے لے لو اس سے پہلے کہ گاڑی چل پڑے، اور بچے کی آنکھوں میں مایوسی پھیل جائے"۔ اب وہی تولیہ اس کے ماتھے سے درد کی شدت سے ابھرنے والا پسینہ صاف کر رہا تھا اور شائد وہ بچہ اب تک تمام تولئے بیچ کر ان پیسوں سے کہیں سے دال روٹی کھا رہا ہوگا۔۔ اس حالت میں بھی اس غریب اور لاچار بچے کے خیال نے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔

اس کی ہمسائی خالہ نے جو دنیاداری نبھانے کو اس کے ساتھ ہسپتال آ گئی تھی، پسینے کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی صاف کئے اور کہنے لگی:

"حلیمہ مجھے پتہ ہے تمھیں اپنی امی یاد آ رہی ہونگی۔۔ ایسے وقت میں لڑکیوں کو ماں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔۔"

"نہیں خالہ، مجھے درد یاد آ رہا ہے، پچھلے سال پہلی دفعہ تھی نا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اب تو پکا پکا پتہ ہے کہ آگے کیا کیا ہونا ہے بس اسی ڈر سے رونا آ رہا ہے۔۔۔" اس نے تولیہ بیچتے انجان بچے کے درد کو پیٹ کے درد میں ہی کہیں دبا لیا۔۔

ہسپتال میں سفید کوٹوں میں ملبوس نرسیں اور جونیئر ڈاکٹرز ادھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر حلیمہ کا دم گھٹتا تھا۔ جب انہوں نے اسے لیٹ جانے کو کہا تو وہ سہم گئی، جانتی تھی اب درد تیز اور اوران کا دورانیہ طویل ہونے والا ہے۔ جونیئر ڈاکٹر نے ساتھ لگی درد ناپنے والی مشین کو دیکھتے ہوئے دوسری ڈاکٹر کو کہا:

"واہ دیکھو اس کی pains کتنی آئیڈیل ہیں۔ جتنے وقت بعد آنی چاہیں اور کتنی دیر ٹھہرنی چاہئیں اس کا بالکل ٹھیک حساب ہے"۔ وہ دونوں اس کی دردوں پر پُرمغز تعلیمی گفتگو کرتی اور اسے سراہتی رہیں اور وہ سوچتی رہی..

"جس درد سے اس کی جان نکلے جا رہی ہے، وہ انکے لئے اطمینان کا باعث ہے کیونکہ جو کچھ انہوں نے گائنی کی کتابوں میں پڑھا ہے اس کی دردیں عین اس کے مطابق ہیں۔۔۔شکر ہے ان کے آلات میں انسانی روح کے درد کا کوئی گراف نہیں اُبھرتا ورنہ انہیں اندازہ ہو جاتا کہ میرے درد کے گراف میں کوئی وقفہ نہیں اور نہ ہی کوئی نشیب ہے وہ بس اوپر ہی اوپر اٹھتا ہے، پتہ نہیں ان کی کتابوں میں روح کے ایسے ہموار درد کو اچھا سمجھا جاتا ہے یا برا۔۔۔فی الحال تو یہ میرے اس گراف کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہیں۔۔"

جب وہ دونوں کھلکھلاتے چہروں والی جونیئر ڈاکٹرز چلی گئیں اور اس کے درد میں بھی اب قدرتی بریک تھا تو اس نے دھیان ہٹانے کو اپنی خالہ کو پچھلے سال کا ہسپتال کا قصہ سنایا جو اس کی یادداشت پر نقش تھا اور اسے ڈراتا بھی تھا اور ہنساتا بھی تھا۔

"خالہ پچھلے سال میں، اپنے بیٹے کی پیدائش کے وقت سرکاری ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ کی بجائے زچہ بچہ وارڈ میں غلطی سے پہنچ گئی تھی، توبہ وہاں ایک کہرام برپا تھا"۔

اسے درد میں کبھی روتے کبھی ہنستے دیکھ کر اس کی خالہ کو اسکی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔۔"تم ہنس کیوں رہی ہو۔۔؟

"ہاں خالہ میں تب بھی ہنس رہی تھی۔۔ پتہ ہے وہاں ایک عورت زور زور سے چیخ رہی تھی اور "اوئے اوئے" کے ردھم میں اپنے شوہر کو گالیاں نکالتی جاتی تھی اور بار بار ایک ہی بات کہے جا رہی تھی کہ اب میں تمھیں لاگے نہیں لگنے دوں گی"۔۔۔ہاہاہا حلیمہ کے ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی نکل آیا۔۔۔

ہمسائی خالہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا دیں۔۔

اسی اثنا میں حلیمہ کا درد پھر لوٹ آیا اور وہ ہنسنا بھول کر ہونٹ بھینچے خالہ کا ہاتھ دبانے لگ گئی۔۔اور بے اختیار منہ سے "اماں" نکل گیا۔۔۔

درد کے دوران ہی خالہ بولی۔"ہائے اسی وقت مائیں سب سے زیادہ یاد آتی ہیں۔۔۔"

اس نے خالہ کے اس جملے کو ایک دفعہ پھر سے نظر انداز کر دیا۔۔۔

"خالہ پتہ ہے اس پٹھانی کو ایک پروفیسر ڈاکٹر نے ڈانٹ دیا۔۔ کہنے لگی۔۔بس کرو شور مچانا، ہر سال یہی کہہ کے جاتی ہو۔۔۔"ہاہاہا.... حلیمہ پھر ہنسنے لگی۔۔کیونکہ ہنستے ہوئے آنکھوں میں پانی آ جائے تو انہیں چھپانا نہیں پڑتا۔۔۔

"کیا کہہ کے جاتی تھی ۔۔ خالہ بات کے تسلسل سے نکل چکی تھی اسلئے سمجھ نہ سکی۔۔۔

"یہی کہ اب کی بار شوہر کو پاس نہیں آنے دے گی۔۔۔ ہاہاہا۔۔حلیمہ کی ہنسی درد شروع ہونے پر ہی رکتی تھی۔۔۔

اب وہ پھر خالہ کا ہاتھ پکڑے دبا رہی تھی۔۔۔

"اب دردیں جلدی جلدی آ رہی ہیں۔۔لگتا ہے کام قریب ہے۔۔"خالہ نے اس کے ہاتھ میں بھنچا ہوا اپنا سرخ ہوتا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہاں خالہ اب تو سانس بھی نہیں لینے دے رہیں۔۔لو پھر شروع۔۔۔۔" آواز اس کے حلق میں ہی دب گئی اور وہ آنکھیں بھینچے چیخ کو روکنے کی کوششوں میں لگ گئی ۔۔ پچھلے سال چیخیں روکنا اتنا مشکل نہیں لگا تھا، اس سال اس کا جسم اور روح دونوں کمزور ہو گئے تھے۔

"خالہ آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی۔۔۔"وہ حسبِ معمول انتہائی مشکل وقت میں بھی دوسروں کی تکلیف کا سوچ رہی تھی۔۔۔

"دیر تو ہو رہی ہے بیٹا، بچوں نے سکول سے گھر آنا تھا، چابی ساتھ والوں کو دے تو آئی تھی مگر پتہ ہے نا بچے گھر آئیں تو انہیں ماں چاہیے ہوتی ہے۔مگر کوئی بات نہیں تمھارا

وقت کٹا کے ہی جاؤں گی۔۔۔ ویسے اب تو درد ہوتی ہے تو میرا ہاتھ دبا لیتی ہو، پچھلے سال کیا کیا ہوگا تم نے۔۔۔۔"

محلے کی یہ خالہ آ تو گئی تھی مگر شائدا سے رہ رہ کے اس کی مرحومہ ماں کی یاد آ رہی تھی یا اس کے مرنے پر غصہ آ رہا تھا، ماں زندہ ہوتی اور اس وقت ساتھ ہوتی تو اس خالہ کو یہ زحمت نہ کرنی پڑتی۔

"خالہ ایک نرس اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دیتی تھی۔۔۔۔ خالہ آپ چلی جائیں، کوئی نرس آ جائے گی جب آخری دردیں شروع ہوں گی۔۔خالہ آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں جب تک تمھیں ڈلیوری روم میں نہیں لے جاتے، تب تک میں تمھارے ساتھ ہوں بیٹا۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور اسے اپنا آپ گاڑی کے پیچھے بھاگتے بچے جیسا لگا۔۔ بے بس اور دوسروں کے رحم و کرم پر۔۔توجہ کی بھیک مانگتا ہوا ایک بوجھ۔

اب دردوں میں وقفہ ختم ہو چکا تھا، اور حلیمہ نے چیخوں کو اس دفعہ حلق میں دبایا نہیں۔۔اسے اس بات کی پرواہ بھی نہیں تھی کہ لوگ اسے چیختے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ وہ اپنے آپ کو اس ان پڑھ عورت سے زیادہ بے وقوف سمجھ رہی تھی، جو ہر سال آ جاتی تھی۔ اس لئے جب حرکتیں وہی ہیں تو چیخنے میں کیسا مضائقہ؟۔۔اس عورت کے ساتھ اس کا شوہر نہیں تھا، ہاں اس کی ماں تھی۔ ان پڑھ لوگوں میں بچوں کے ساتھ انصاف رکھنے کی ایک قدرتی صلاحیت ہوتی ہے کیونکہ فطرت انصاف ہے لیکن پڑھ لکھ کر لوگوں کی تقدیم بدل جاتی ہے۔ وہ کئی فیصلے اپنی ذاتی پسند ناپسند پر کرتے ہیں اور اس لئے فطری توازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے جو جانے انجانے نا انصافی کو جنم دیتا ہے۔ انصاف کے لئے فطرت کے نزدیک رہنا ضروری ہوتا ہے۔۔شائداسی لئے ان پڑھ لوگوں کے بارہ بچے بھی ہوں تو وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔"

وہ نرس جس نے پچھلے سال اس کا ہاتھ پکڑے رکھا تھا، نہ جانے اس وقت کسی اور درد کی ماری، تنہا عورت کا ہاتھ اسی خندہ پیشانی سے تھامے بیٹھی ہوگی۔ اور جب اس عورت کا بچہ دنیا میں آ جائے گا تو بڑی شفقت سے اپنا زخمی ہاتھ دکھا کے کہے گی "دیکھو تم نے میرے بچارے ہاتھ کا کیا حال کر دیا" اُس نرس جیسے لوگ تکلیف میں مبتلا لوگوں کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے نہ اس وقت آواز پیدا کرتے ہیں کہ کہیں ان مصیبت کے ماروں کا آخری سہارا بھی نہ چھوٹ جائے اور چیخ دبانے والوں کو ان کا ہاتھ بغیر کسی رکاوٹ کے میسر رہے۔ کتنا پیارا چہرہ تھا اس نرس کا۔ روشن چمکتا ہوا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر جس کی تعلیمی ڈگریاں اس نرس کی انسانی ہمدردی کے آگے ہیچ تھیں۔۔اس پر چلائی تھی۔۔

"جلدی کرو، ایک گھنٹہ ہو گیا ہے تمھیں۔۔ کوئی اور ڈاکٹر ہوتی تو اب تک تمھارا آپریشن ہو گیا ہوتا۔ اتنا انتظار کوئی نہیں کرتا۔۔۔"

ڈاکٹر کی اس جاہلانہ انداز میں تنبیہہ نے اسے لرزا دیا تھا اور اس نے جی جان سے زور لگا کے بچے کو دنیا میں دھکیل دیا تھا۔ اسے اس جاہل ڈاکٹر کا چہرہ بھی بھول گیا تھا مگر اس مہربان نرس کے چہرے کی روشنی آج بھی اس دل کو گرماتی تھی۔ اسی لئے آج مشکل کی اس گھڑی میں برسوں پہلے بچھڑی اپنی ماں نہیں، اُسے وہ نرس یاد آ رہی تھی۔

اور جب اسکا بیٹا دنیا میں آ گیا تھا اور ڈاکٹر نیچے ادھڑی جلد کو ٹانکوں سے جوڑ رہی تھی اور حسبِ عادت بڑبڑا رہی تھی "توبہ پہلا بچہ اتنا موٹا کر لیتی ہیں کہ نکالنا ہی عذاب ہو جائے اور دیکھو کتنے نخروں سے نکالا اسے"۔ نرس جو اس کے بیٹے کے جسم سے اسی کے گندے مادے صاف کر لائی تھی، ڈاکٹر کے جاتے ہی بچہ اسے دکھاتے ہوئے بولی تھی۔ "بڑا جوان بیٹا پیدا کیا ہے ماشاءاللہ۔۔" ڈاکٹر اس کی جلد کو ٹانکے لگا کر اس کی روح کو زخمی کر گئی تھی، نرس کے الفاظ مرہم ثابت ہوئے تھے اور وہ اپنے بیٹے کا سورج جیسا چہرہ دیکھ کہ سب درد بھول گئی تھی۔

"شائد نرسنگ میں انسانی ہمدردی پڑھائی جاتی ہے ڈاکٹری میں نہیں۔۔" اس نے باہر آ کر اپنے شوہر کو کہا تھا۔۔

"یہ تو انسان پر منحصر ہے ورنہ کتابیں کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔" اس کے شوہر کے چہرے سے بیٹے کا باپ بننے کا فخر جھلک رہا تھا۔۔

ایک جونیئر ڈاکٹر، جس کا چہرہ بہت نرم تھا اور ابھی اس میں سنیئر ڈاکٹرز والی سختی اور روکھا پن نہیں آیا تھا, بڑے پیار سے اسے بتا رہی تھی کہ کتنے سینٹی میٹر dilute ہو گیا ہے۔۔اور آج بھی اسے ہسپتال کی فضا درد کی جیل لگتی تھی، جو اپنے قیدیوں کو آزاد نہیں کرتی۔ ڈاکٹرز اور بھاگتی دوڑتی نرسیں اسے زہر لگ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے عمر بھر کے لئے یہ دردیں یونہی چلتی رہیں گی اور وہ سٹاف کے لئے ایک "بہترین تعلیمی سبجیکٹ" رہے گی۔

درد کی شدت جب ہولناک حد تک بڑھ گئی تو اسے ڈلیوری روم میں لایا گیا اور اب اس کا دل کر رہا تھا excellent pains کہنے والی کسی سٹاف کے منہ پر رکھ کر مکہ مار دے۔ شائد پچھلے سال کی نقاہت ابھی مکمل طور پر گئی نہیں تھی، اسلئے اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ لمحہ بہ لمحہ دردوں کے کنویں میں گرتی جا رہی تھی۔ اس کمرے میں حسبِ رواج شوہر ساتھ اندر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ باہر ٹہل رہا ہوگا۔ پچھلے سال بھی یہی منظر تھا اور جب اس کے پاس آیا تھا تو س کی گود میں بیٹا دیکھ کر اس نے سر فخر سے اٹھا کر کہا تھا۔۔

"دیکھو میں نے چھوٹی سی بچی کو ماں بنا دیا"۔۔ وہ چھوٹی ہی سی تو تھی، ہنستی کھیلتی، شرارتیں کرتی جس کے چہرے پر وقت ٹھہر گیا تھا تئیس کی تھی تب بھی سترہ کی لگتی تھی۔ اور جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کمرے میں اکیلی تھی اور بچہ اسکی چھاتی منہ میں ڈالے پچا کے مار رہا تھا تو نجانے کیسے یکا یک یہ ایک عجیب سا خیال اس کے دل و دماغ پر چھانے لگا تھا: کہ وہ جب مرے گی، تو اس کا بیٹا اسے آوازیں دے گا، مگر وہ جو اس سے اتنا پیار کرتی ہے آنکھ نہیں کھول سکے گی۔ میرے بیٹے کو میری ضرورت ہوگی اور میں بے بس ہونگی۔۔ ماؤں

کو ضرورت کے وقت بچوں سے صرف موت ہی دور کر سکتی ہے جیسے اسکی ماں زندہ ہوتی تو کیا اس کی اتنی بڑی تکلیف میں اس سے دور رہ سکتی تھی؟

خیالوں کی آندھی اسے اڑائے جا رہی تھی۔ شائد اسی لئے بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ پیدائش کے بعد ماں اور بچے کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ انہیں پوسٹ پارٹم ڈپریشن کا نام نہیں آتا مگر ان کے نزدیک ایک جن ہے جو پیدائش کے بعد عورتوں کو چمٹنے کے لئے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔۔ حلیمہ کا جن اسے موت سے ڈرا رہا تھا اور اسے اس چارپائی تک لے گیا تھا، جہاں وہ بے بس مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اور اس کا جوان بیٹا، (نرس نے بھی تو کہا تھا کیسا جوان بیٹا پیدا کیا ہے)، اسکی چارپائی کو کندھا دے رہا تھا۔ اس نے اپنی گود میں ہمکتے بے بس بچے کو دیکھا جو اس کی مدد کے بغیر ابھی ہل بھی نہیں سکتا تھا، جو اپنا ننھا سا معدہ بھرنے کے لئے اس کے دودھ کا محتاج تھا، کل کو میں اس کے بازوؤں کی محتاج ہونگی جب وہ مجھے، اپنی بے بس ماں کو، اسکی آخری منزل تک چھوڑ کر آئے گا، اا ور وہ تب اس کی مدد کے بغیر قبر میں نہیں اتر پائے گی۔ دنیا کا نظام یہی ہے میں اسے دنیا کی پہلی منزل میں لائی ہوں یہ مجھے آخری منزل تک چھوڑ کر آئے گا کیسا ظالم ہوتا ہے یہ وقت کا پہیہ۔۔

اس کی آنکھیں اس منظر کے تصور میں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔۔

"بیٹی تم پر ماں بن کر بہت روپ آیا ہے۔ رو کیوں رہی ہو؟ ماں بن کر عورت مکمل اور حسین ہو جاتی ہے، تمھارا ہر طرف سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ دیکھنا اپنے شوہر کی نظر میں تم کتنی معتبر ہو جاؤ گی۔۔"

نرس جب اس کا ٹمپریچر دیکھنے آئی تو اسے روتا دیکھ کر اپنی طرف سے خوش کرنے لگ گئی تھی۔

اب کے برس درد نا معلوم نہیں تھا، اجنبی نہیں تھا، جانا پہچانا تھا۔ جاننے کا بڑا نقصان ہوتا ہے کیونکہ اسے سب پیچ و خم سے آشنائی تھی۔۔ اس کی چیخیں کمرے کی چھت پھاڑ رہی

تھیں۔۔اسے نہیں پتہ کب وہ آخری چیخ اس کے منہ سے برآمد ہوئی جس کے ساتھ بچہ دنیا میں آتا ہے۔۔وہ تو نرس کی آواز سے ہوش میں آئی۔۔

"بیٹی ہوئی ہے"۔۔۔

پھر اس کے ساتھ ایک نازک سا پھول سٹریچر پر لٹا دیا گیا تھا اور جو آیا اسے گھسیٹ رہی تھی بولی:

"پیسے دے دیں، میں نے آپ کی غلاظت صاف کی ہے۔۔بچی کے ساتھ ہی آپ نے۔۔۔"

وہ جو مارے کمزوری کے آنکھیں بھی کھولنے سے قاصر تھی اور ابھی تک اپنی نوازائیدہ بچی کو بھی نہیں دیکھ پائی تھی ایکدم سے غصے میں بھر گئی۔۔

"تمھارا خیال ہے کہ میں اندر ڈیلوری روم میں اپنا بٹوہ سینے سے لگائے بیٹھی ہوں۔۔۔"

صفائی والی مائی کھسیانی ہوگئی۔۔"نہیں میرا مطلب کمرے میں جا کر اپنے خوند کو بتا دینا، کہ میں نے آپکی۔۔۔۔"

"اچھا چپ کرو۔۔۔۔۔شرم اور نخوت سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔

"کسی اور کو نہ پیسے دے دیں۔۔" مائی اپنے مدعے پر قائم رہی۔۔۔

"توبہ یہ پرائیویٹ ہسپتالوں کا یہ حال ہے جہاں فیسوں کے نام پر مریضوں کے بنک بیلنس نچوڑ لئے جاتے ہیں۔وہاں کے تنخواہ دار عملے کا یہ حال کہ بھکاریوں کی طرح پیسے مانگتے ہیں"۔اس کے شوہر نے غصے میں کہا، جب حلیمہ نے کمرے میں آتے ہی بیٹی دکھانے سے بھی پہلے اسے اس مائی کے دعوے کے متعلق آگاہ کیا تھا۔

"اچھا نا! پیسے دے دیں اسے۔۔۔"

مائی نے پیسے پکڑتے ہی خریدی ہوئی دعائیں انہیں دیں اور بھاگ کر کمرے سے

نکل گئی، کیونکہ اس کے بعد ڈلیوری روم میں ایک اور عورت کو لے جایا جا رہا تھا، وہ کوئی بھی چانس یا عورت مس نہیں کر سکتی تھی۔

"میری بیٹی کتنی پیاری ہے، دیکھنا اس کی پیدائش کی خبر سنتے ہی"میرے ناراض گھر والے مان جائیں گے اور بھاگے بھاگے اسے دیکھنے آجائیں گے۔۔ہمارے خاندان میں سارے ہی لڑکے ہیں۔یہ پہلی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔۔"

اس نے فاروق کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور سوچا" اب تو وقت گذر گیا کوئی آئے یا نہ آئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔۔"

اس نے دردوں کا وقت کبھی کسی نرس اور کبھی کسی ہمسائی کا ہاتھ پکڑ کر اکیلے ہی گذار لیا تھا۔۔اس کے شوہر نے پہلے بیٹے کی پیدائش پر بھی یہی کہا تھا کہ برف پگھل جائے گی، میرے ابو بچے کا سنتے ہی بھاگے آئیں گے اور تمھیں اپنی بہو تسلیم کر لیں گے۔مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔برف پگھلنے کی بجائے مزید جم گئی تھی۔

فاروق، مرتضی کیسا ہے اسے دیکھ آئے؟ بھائی کو تنگ تو نہیں کر رہا تھا؟ حلیمہ کو فرصت ملتے ہی بیٹے کی فکر کھانے لگی۔

وہ بدمعاش بالکل ٹھیک ہے، خالہ فریدہ تمھیں چھوڑ کر چلی گئیں تھیں؟

"ہاں انہیں جانا تھا، انہوں نے پہلے ہی کہا تھا جب مجھے ڈلیوری روم میں لے جائیں گے تو وہ چلی جائیں گی۔"

"ہوں۔۔۔چلو بڑا احسان ہے ان کا، تمھیں بھوک لگی ہوگی کیا لاؤں۔۔۔؟"

"کوئی گھر کی پکی چیز لا سکتے ہو؟ کوئی دال، کوئی سبزی۔۔۔اس نے بڑی حسرت سے فرمائش کی۔۔ابھی ساتھ والے کمرے سے بہت مزے کی خوشبو آرہی تھی۔۔"

"پھر ایسا کرتا ہوں ساتھ والے کمرے سے ہی مانگ لاتا ہوں۔۔گھر کا کھانا کہاں سے لاؤں؟"

"میرا بھوک سے برا حال ہے اور ابھی کوئی باہر کی چیز نہیں کھا سکتی اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔۔" اس کی آنکھوں میں بار بار نمکین پانی اتر رہا تھا۔۔

"اچھا ایسا کرتا ہوں ابھی سوپ لے آتا ہوں۔۔" اس کے شوہر کی خوبی تھی یا خامی اس کا مشاہدہ بہت کمزور تھا اس لئے وہ حلیمہ کے آنسو نہیں دیکھ پایا تھا۔۔۔

"اچھا!! کمزور سی آواز حلق سے ابھری۔۔۔

اب وہ کمرے میں پھر تنہا رہ گئی تھی۔۔ بیٹی کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔ کتنی خوبصورت تھی اسکی بیٹی، بالکل چاند جیسا چہرہ۔۔

بیٹے کا نام انہوں نے اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی سوچ رکھا تھا، بیٹی کا ابھی سوچا جا رہا تھا۔۔ ہسپتال میں نام کے اندارج کے لئے بھی ابھی وقت مانگا تھا۔۔ ماہ رخ۔۔ ایسی چاند چہرہ کا نام ماہ رخ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔۔

سال پہلے والا تنہائی کا جن ایک دفعہ پھر سے ذہن میں پسر کر آ بیٹھا تھا۔۔ اب منظر میں جنازے کی چارپائی نہیں تھی بلکہ ایک ڈولی تھی، چار کندھوں پر سوار ایک ڈولی۔۔ کہار ڈولی کو حلیمہ سے دور لئے جا رہے تھے۔۔ اس کی ناڑو سے کاٹ کے اس کی ماہ رخ کو ڈولی میں بٹھا دیا گیا تھا۔۔ وہ ہمکتے ہمکتے چہکنے لگ گئی تھی۔۔ یہ تو بڑی ہو گئی۔۔ میری طرح بڑی ہو گئی؟

اپنی ماں سے دور ہو گئی؟

میرے ناڑو سے خود کو دور لے جائے گی اور پھر اس کے ناڑو کے ساتھ ایک بچہ آ کر چپک جائے گا۔۔؟

اس بچے کو دنیا میں لانے کے لئے یہ یہی دردیں سہے گی کبھی چیخے گی کبھی برداشت کرے گی اور کیا ڈاکٹر اسے بھی چیخ کر کہے گی؟ جلدی کرو، کوئی بچہ پیدا کرنے میں اتنا بھی نخرہ کرتا ہے، کیا یہ بھی دردوں کی تکلیف سے گھبرا کر سوچے گی مرنا آسان ہے یا اس درد کا سہنا؟

اف یہ دردیں۔۔ یہ ماہ رخ کو آنے والی دردیں۔۔۔ کیا صفائی والی آیا اس کے فارغ ہوتے ہی اسے بھی یاد دلائے گی کہ بی بی مجھے پہلے خوش کر دیں۔۔۔ یہ جو، اب میری گود میں اپنی سب تکلیفیں، سب پریشانیاں ڈال کر معصومیت سے بے خبر سوئی ہوئی ہے، ایک وقت آئے گا میں اس کی تکلیف بٹا نہیں پاؤں گی اور بے بسی سے اسے دردوں سے تڑپتے دیکھوں گی۔؟"

اس سوچ نے حلیمہ کو اتنا رلایا کہ اسکی ہچکی بندھ گئی۔۔ بیٹے کے کندھوں پر سوار خود کو جنازے کی چارپائی پر بے بس لیٹے تصور نے اسے اتنی اذیت میں مبتلا نہیں کیا تھا جتنی بیٹی کی ممکنہ دردوں نے اسے نڈھال کر دیا۔۔، میں کیا کروں گی۔ ہائے میرے اللہ میں کیا کروں گی۔۔۔؟

اس نے سوئی ہوئی بچی کا ننھا سا ہاتھ گھبرا کر تھام لیا اور عہد کرنے والے انداز میں بولی:

"میری ماہ رخ، میری پری میں تجھے تیرے ایسے نازک وقت میں کبھی اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، تیرے ہاتھ کو کسی نرس یا کسی ہمسائی کے سہارے اکیلا نہیں چھوڑوں گی، تیرے لئے میرا ہاتھ ہو گا، ایک ماں کا ہاتھ جسے تھام کر تو درد کے اس سمندر کو آسانی سے پار کر جائے گی۔ مجھے اس درد میں ماں کا ہاتھ تھام کر گذرنے کا تجربہ نہیں۔۔ مگر تو مجھے بتانا کہ کیا ماں کا ہاتھ ہاتھ میں ہو تو درد کی شدت کم ہو جاتی ہے؟

کم ہوتی ہے یا نہیں مگر مجھے پتہ ہے اس وقت آنکھوں میں ماں کی تصویر ہی ہوتی ہے اور میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اگر مرتضیٰ میرے جنازے کی چارپائی کو کندھا دے کر بھی لے جا رہا ہو گا، تو تیری درد کی چیخ سنتے ہی موت کو دھوکہ دے کے وہاں سے بھی تیرے پاس بھاگ کر آ جاؤں گی۔ مرتضی کی پکار پر نہیں تیری چیخ پر ضرور لوٹ آؤں گی، یہ

میرا تجھ سے وعدہ ہے میری ننھی پری، تجھے یہ درد کبھی اکیلے نہیں سہنے دوں گی۔۔۔اب اداسی کا جن اس کے پورے وجود کو لپیٹے ہوئے تھا۔ فاروق سوپ پکڑے لوٹا تو کمرے میں سسکیوں کی گونج سن کر ٹھٹک گیا۔۔

اسے یوں پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر کچھ اور ہی سمجھا اور چڑ کر بولا۔۔۔

"بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں تم کیا جاہل عورتوں کی طرح بیٹی کا سوگ منا رہی ہو، دیکھو میری بچی کو دہلا دیا ہے تم نے۔۔۔" آج فاروق کے چہرے پر بیٹی کے باپ ہونے کی رحمت جھلک رہی تھی۔

اور وہ فاروق کے ڈر سے اپنے آنسو چھپانے کے لئے رضائی کے سینے میں گھستی چلی گئی، اسے لگا جیسے رضائی اس کی ماں ہے اور فاروق کو ڈانٹ رہی ہے کہ:

"چپ کرو تم نے تو میری بچی کو دہلا دیا ہے۔۔۔۔"

کہانیوں کی کتاب!!

وہ بہت پیارا بچہ تھا جیسے بچے ہوتے ہیں، مگر وہ عام بچوں سے کہیں زیادہ ذہین تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی، جاننے کی خواہش رکھنے والی چمک تھی۔ وہ ماں باپ کے درمیان میں چل رہا تھا اور کبھی ایک کا چہرہ اور کبھی دوسرے کا دیکھ کر کوئی نہ کوئی سوال پوچھتا جاتا تھا۔

بچے کا باپ گھبرا کر اس کی ماں سے پوچھتا قاسم کے ان مشکل سوالوں پر خوش ہونا چاہیے یا خوفزدہ؟

ماں فخر سے اپنے بیٹے کو دیکھتی، بولتی کچھ نہ بس رعونت سے مسکرا کے رہ جاتی مگر دل میں سوچتی یہ میرے وہ ادھورے خواب پورے کرے گا جو میں کبھی اپنے لئے دیکھتی تھی اور جو میرے خاندان کی میراث ہیں، جو مجھ تک میرے باپ کے ذریعے پہنچے تھے۔

مگر آج اس کے چہرے کی طرح اس کا دل بھی سپاٹ تھا، وہ اپنے شوہر کے سوالوں کا جواب دینا تو دور کی بات ہے اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کر رہی تھی۔

سڑک کنارے ایک پتھر پڑا ہے، اس کی ماں کے چہرے پر صاف پڑھی جانے والی تھکاوٹ ہے اور وہ وہیں اُسی پتھر پر بیٹھ گئی ہے جو نجانے کب سے اُدھر ہی دھرا ہے اور کتنے لوگ اس پر کبھی اپنی تھکاوٹ مٹانے اور کبھی بکھرے خوابوں کو سمیٹنے بیٹھ جاتے ہیں۔ باپ کو اپنی ہمسفر کے پیچھے رہ جانے کا احساس تک نہیں ہوا اور وہ بچے کی انگلی تھامے آگے

ہی آگے چلتا جا رہا ہے مگر بچہ مڑ مڑ کے ماں کو دیکھ رہا ہے، اس چھوٹی سی عمر میں اسے سمجھ آ گئی ہے کہ اسکی ماں ساتھ نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ باپ کو بھی پتہ چل جائے کہ "ماں ساتھ نہیں ہے"۔ وہ ماں کے رکنے سے خوفزدہ ہو گیا ہے، اس سے اب بولا بھی نہیں جا رہا ہے، سارے سوال حلق میں پھنس گئے ہیں اور وہ ایسی جگہ ماں کو رکتا نہیں دیکھنا چاہتا جہاں باپ اس کے ساتھ نہیں رک رہا، اور باپ کو ایسے چلتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا جہاں ماں کے رکنے کا اسے احساس نہ ہو۔

باپ کے تیز تیز قدموں کا ساتھ دیتے دیتے وہ ہانپ گیا ہے، ماں کو اس پتھر پر پتھر کی طرح بیٹھے دیکھ کر وہ سہم گیا ہے۔ باپ بچے کی ذہانت سے بہت مطمئن ہے، اس لئے وہ اپنے قدم آہستہ نہیں کر رہا۔ وہ سوچ رہا ہے یہ فطین بچہ دنیا کی تیز رفتاری میں اس کا نام روشن کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتا ہے اور یہ بچہ دنیا کو اپنے آگے جھکا دے گا۔ اسے اپنا بچپن یاد آتا ہے، جہاں اس کا باپ پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں میں پیری فقیری کی گدی پر بیٹھا ہے، لوگ اس کے آگے جھک تو رہے ہیں مگر وہ دنیا کو جھکانے میں ناکام ہے۔ لوگ آپ کے آگے سر جھکائیں مگر آپ دنیا کو نہ جھکا سکیں تو غربت جنم لیتی ہے۔ وہ آٹھ بہن بھائی تھے جو لوگوں کے گھروں سے آیا ہوا کھانا کھاتے تھے۔ جہاں کھانا کھانے کی خود مختاری نہیں تھی تو وہاں خوابوں کو دیکھنے اور پالنے کی عیاشی کہاں سے آتی؟ باپ نے پیری تو خوب کی مگر غربت کو مات نہ دے سکا اور بچے کھاتے پیتے رشتہ داروں میں تاش کے پتوں کی طرح بانٹ دئے۔ وہ آج تک اپنے گھر کی چھت سے نکل کر رشتے داروں میں بانٹے جانیکی اذیت سے نہیں نکل سکا، یہاں تک کہ کینیڈا جیسے بڑے ملک میں بیٹھ کر بھی، وہ زیادہ بچوں کے پیٹ بھرنے کے خوف اور نہ بھرنے کی صورت میں بچوں سے بے وفائی کے خوف کو دل سے نہیں نکال سکا۔ اسی لئے اس نے پہلی رات ہی اپنی بیوی کو بتا دیا تھا کہ میں

صرف ایک بچہ پیدا کروں گا اور اس کا اپنے جیسا نام تو نہیں رکھ سکتا مگر اسے اپنی نامکمل خواہشوں کو پورا کرنے کا کام ضرور دے سکتا ہوں۔

اسے یاد آ رہا تھا جب باپ نے اچھے مستقبل کا ایک لاجواب بہانہ تراش کے اسے ایک امیر رشتے دار کے حوالے کر دیا تھا تو ماں بھی اس سازش نما قربانی میں چُپ کر کے ساتھ ہی مِل گئی تھی۔ دونوں کی سازش سے اسے اچھا مستقبل تو مل گیا مگر ماں باپ کی توجہ اور پیار سب اس آٹے میں گندھ گیا۔ اسی لئے وہ ہر وقت اپنے آپ سے یہ عہد دہراتا رہتا "میں اپنے بیٹے کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گا"۔

محبتوں کا مارا ہوا، نہ بچے کے اکھڑتے قدم دیکھ رہا ہے اور نہ ماں کو اپنے خوابوں کے ساتھ پیچھے پتھر ہوتے دیکھ رہا ہے، اس کے قدم اور تیز تیز اٹھ رہے ہیں اور بچہ اب باقاعدہ ساتھ گھسٹ رہا ہے

باپ کے بالکل برعکس اس کی ماں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی ماں کے باپ نے اس کی آنکھوں میں رنگا رنگ خواب سجائے تھے۔ ماں کی زندگی کی کتاب خوابوں سے بھری پڑی تھی۔ نانا، ماں کو فیری لینڈ میں رکھتے تھے، عام لوگوں کی پہنچ سے دور۔ ماں نے شادی کے بعد اپنے گھر کو بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک طلسماتی محل میں بدل رکھا تھا، عام لوگوں کی دسترس سے دور، گھر کے کونے کونے میں خوابوں کی کیاریوں کی کیاریاں بھری پڑی تھیں جن سب کو پانی دینے کا کام وہ قاسم کو سمجھاتی رہتی تھی اور وہ اکتا کر ماں سے کہتا بس کرو ماں مجھے ان خوابوں سے ڈر لگتا ہے۔

"رنگین خوابوں سے ڈر؟ ماں اسے پیار سے ڈانٹ کے پوچھتی تھی

"ہاں ماں پتہ نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے یہ رنگ میری آنکھوں کو اندھا کر دیں گے" وہ ماں کو بہلاتا ہے، چھ سال کی عمر میں تیس سال کی ماں کو جان لینا کتنا کرب ناک ہوتا۔ ماں

نے اپنے سارے خواب سیسے کی طرح اس کے کانوں میں انڈیل رکھے ہیں اور اس کی آنکھوں کو ان خوابوں سے اتنا بھر دیا ہے کہ بچے کے پاس اپنے خوابوں کے لئے اپنی آنکھیں ہی نہیں باقی بچیں اور اسے اپنے اندھے پن کا احساس ستانے لگا ہے۔

"اندھے ہوں تیرے دشمن اور ماں گھبرا کر اسے سینے سے لگا لیتی تھی۔

دوسری طرف باپ، بہت سے بچوں میں پیدا ہو جانے والا ایک اور بچہ، اپنی محرومی کی ماری کہانیاں سناتا رہتا تھا، وہ اس سے بھی اکتا کر پوچھتا تھا" ابا آپ کی کہانیوں میں کیا کوئی ایسی کہانی نہیں ہے جسے سن کر میں ہنس سکوں؟"

باپ رو دینے والا ہو جاتا اور کہتا میری زندگی میں بس یہی رلا دینے والی کہانیاں ہیں۔ ہنسنے والی کہانیاں کہاں سے لاؤں؟ لیکن جب تمھاری زندگی کی کتاب تیار ہو گی تو اس میں بہت ہنسنے ہنسانے والی، دل کو لبھانے والی رنگا رنگ کہانیاں ہونگی۔

خوابوں میں قید ماں اور محبتوں کا مارا باپ وہ دونوں اس میں اپنی اپنی روح تحلیل کرنے میں لگے رہتے تھے اور کہتے قاسم تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمھیں اتنا پیار اتنی توجہ اور اتنے سارے خواب مل رہے ہیں۔ مگر وہ سوچتا اگر وہ اتنا ہی خوش قسمت ہے تو اس کے کمزور کندھے ابھی سے خوابوں اور عذابوں کے بوجھ سے جھک کیوں رہے ہیں؟ اور اندھا ہونے کا خوف اسے دن بدن کیوں کھائے جا رہا ہے؟

نسیمہ اور ابصار کے گھر میں قاسم کو ایک بچے کی طرح نہیں بلکہ ایک تیسرے بڑے فرد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اس سے کبھی کسی نے بے بی ٹاک نہیں کی تھی۔ اس نے خود بھی کبھی تھتھلا کر بات نہیں کی تھی، اس کی زبان اور سوچ دونوں میں ہی روانی اور پختگی تھی۔ وہ ماں باپ کے خوابوں اور کہانیوں سے اکتا تو جاتا تھا مگر بڑی ذمہ داری سے سوچتا تھا کہ خدا نے اسے ان کے پاس شائد بھیجا ہی اسلئے تھا کہ وہ سب انہیں دلا دے جو آج تک انہیں زندگی

نے نہیں دیا۔

باپ کے ساتھ چلتے چلتے اس نے مڑ کر پھر ماں کو دیکھا جو وہیں پتھر پر نڈھال بیٹھی ہے۔

آج سے پہلے وہ کبھی چلتے چلتے رکتی نہیں تھی۔ اسکی ماں ہمیشہ اس کے باپ کے ساتھ قدم ملا کے چلتی رہتی تھی یہاں تک کے ان کا" مختلف سا گھر" آ جاتا تھا، جہاں سامان کم اور خواب اور امیدیں بھری پڑی تھیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا، کل رات جو ماں باپ کے کمرے سے ماں کی روتے ہوئے بولنے کی غیر معمولی آوازیں آ رہی تھیں، ماں کا تھک کر رک جانا اور باپ کا متوجہ نہ ہونا، کیا اس کا سلسلہ کل رات سے جُڑا ہوا ہے؟ اس وقت بھی وہ خوف سے اپنے کمبل میں دبک گیا تھا اور اب بھی اس کا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ ان دونوں نے دن کا آغاز اور اس واک کا آغاز نارمل طریقے سے شروع کرنے کے لئے جتنے بھی جتن کئے تھے، ارادے باندھے تھے، اب وہ سب پتھر پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ دونوں ہی منافق نہیں تھے اس لئے بس اتنا ہی بھیس بدل سکے۔

گھر پہنچتے پہنچتے وہ دونوں" سب اچھا ہے" کا ماسک پہنے پہنے تھک گئے تھے اور وہ کوئی بچہ تھوڑی تھا، وہ تو اس گھر کا ایک تیسرا بالغ فرد تھا گھر کے اندر آتے ہی ماں کو نجانے کیا ہوا اس نے بچے کو کندھے سے زور سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا، باپ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔۔" بچہ ہے دور رکھو اسے"۔

"نہیں ہے بچہ، اسے بھی سب پتہ ہو۔۔۔ پتہ ہو کہ اس کی ماں کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور اسے پتہ ہو دھوکہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ہسٹریائی انداز سے چیخی۔

باپ نے بے بسی سے بچے کو دیکھا" اچھا بتاؤ اسے سب بتاؤ۔۔۔۔"

"تمھارے باپ کا شادی سے پہلے کسی عورت سے جسمانی تعلق تھا، اس نے مجھے خود نہیں بتایا۔ کل اس کے بھائی نے فون کر کے بتایا۔ اس شخص نے ہمارے یعنی میرے اور اپنے رشتے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی، دھوکے پر رکھی۔ اس نے میرے آئیڈلزم کے سارے بُت توڑ دیئے ہیں۔ اس گھر کو جس سچائی کے ساتھ میں نے سینچا تھا وہ برباد کر دی اس نے۔۔۔۔"

"تم شادی سے پہلے ہوئی کسی بھی غلطی کو دھوکہ کیسے کہہ سکتی ہو؟ باپ غرایا۔۔۔

غلطی؟ یہ غلطی ہوتی ہے۔۔ اور دھوکہ یہ ہے کہ تم نے مجھ سے چھپایا۔۔ ماں بھی اسی طرح غرائی

چھپانا دھوکہ نہیں تھا، مصلحت تھی اور مصلحت سے بولے گئے جھوٹ، جھوٹ نہیں ہوتے۔۔۔ باپ نے بچے کی بدلتی رنگت دیکھ کر اپنے انا کے غبارے سے ہوا تھوڑی کم کرنے کی کوشش کی۔

مگر ماں اور پھُول گئی؛ تم انصاف کی بات کرتے تھے نا کہ زندگی نے تم سے انصاف نہیں کیا۔ اب میں تمھیں بتاؤں گی انصاف کیا ہوتا ہے؟

اب وہ دونوں بچے کو بٹھا کر بھول چکے تھے اور وہ دھوکے، جسمانی تعلق، مصلحت، آئیڈلزم، انصاف، ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر ماں باپ کی زوردار آوازوں سے اس کا دماغ کام کرنا بند کر چکا تھا اور وہ صرف سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ یہ اس گھر کے لئے اور اس بچے کے لئے ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ وہ بچہ نہ نظر آنے کے لئے، اپنے کانپتے ہاتھ، دھڑکتا دل، ماتھے پر آیا پسینہ چھپانے کے لئے جتن کر رہا تھا۔ بڑا نظر

آنے کی کوشش میں اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھیل گئی تھیں اور سر نارمل سے زیادہ اٹھ گیا تھا۔ مگر اس سے زمانے بھر کی محبت کرنے والے، اس کے آئیڈیل ماں باپ، اپنی اپنی اناؤں کے خول میں بند یہ فرق دیکھ ہی نہ پائے۔

اور پھر اس گھر پر ایک اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔ جس گھر کی دیواروں اور دروازوں پر تتلیوں، پھولوں کے رنگ اور خوابوں کی باتیں منقش تھیں وہاں اب ٹوٹے ہوئے اعتماد کی اور اناؤں کی خاموش قبریں ابھر آئیں۔ ایک ننھی سی قبر بچے کے نومولود خوابوں کی اس کے اپنے ہی اندر کھدنے لگی۔" قبر زیرِ تعمیر" کا بورڈ پھیلی آنکھوں سے نظر آنے لگا۔

قبروں کے اس گھر میں خاموشی کے دن اور سسکیوں بھری کئی راتیں گذر گئیں۔ اور پھر ایک دن ماں نے باپ کو انصاف دینے والا وعدہ پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ باپ کا بچپن ناانصافیوں نے ڈس لیا تھا، اس نے ماں کے اس غیر فطری فیصلے کو قبول کرتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے تم بھی وہی غلطی کر آؤ جو شادی سے پہلے مجھ سے سرزد ہوئی، اور جب ہم ہم پلہ ہو جائیں تو پھر سے ایک نئی زندگی شروع کر دیں گے، میں تمھاری محبت میں یہ کڑوا گھونٹ بھی بھرنے کو تیار ہوں اور، یہیں اپنے لئے اور قاسم کے لئے تمھارا انتظار کروں گا۔ مجھے تمھاری یہ ڈیل منظور ہے۔

مگر بچہ اس ڈیل کو سمجھ نہیں پایا۔ وہ اپنے آپ کو جتنا بڑا مرضی تصور کر لیتا، تھا تو "بیچارہ" بچہ ہی۔ ماں جو ہر لمحے اسے کسی بڑے فرد کی طرح پیش آتی تھی، اب اس کی انگلی کسی دو سال کے بچے کی طرح تھامے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ وہ گھر جو سچ کے نعروں سے گونجتا رہتا تھا، ایک اور سچ کی تلاش میں خالی ہو گیا۔ وہ گھر جہاں انصاف ہی کی دہائی تھی،

ایک اور انصاف کی کہانی لکھنے کے لئے ویران ہو گیا۔ بچے نے مڑ کر گھر پر نگاہ ڈالی۔ مگر آنکھیں اتنی بھیگی ہوئی تھیں کہ اس گھر میں بسنے والی سب تتلیاں مرجھائی نظر آئیں۔ اس فیصلے کے بعد آج باپ نڈھال سا بیڈ پر بیٹھا تھا، بالکل اسی طرح جیسے اس دن ماں پتھر پر تھکی ہاری بیٹھی تھی۔۔ اس دن باپ اس کی انگلی تھامے اسے گھسیٹ رہا تھا۔ آج ماں بغیر پیچھے مڑے اس کی انگلی تھامے تیز تیز چلتی گھر کی چاردیواری پار کر گئی۔

اب وہ اپنی ماں کے ساتھ جس انکل کے گھر آیا، وہ اس کے باپ کا قریبی دوست تھا۔ یہاں آتے ہی ماں اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگی اور وہ انکل بڑی توجہ سے سب سنتا اور ماں کو سینے سے بھینچتا رہا۔۔ پھر وہ دونوں بچے کو باہر بٹھا کر اندر کمرے میں چلے گئے۔ جب وہ دونوں بہت دیر تک باہر نہ آئے تو وہ ڈر گیا۔ اس پر خوف اتنا حاوی ہو گیا کہ وہ ماں کی بات بھی بھول گیا، جو اندر جانے سے پہلے اسے سختی سے وہاں سے ملنے سے منع کر کے گئی تھی۔ اور وہ ڈرا ہوا بھاگ کے دروازے کی درز سے چمٹ گیا۔ وہاں سے بچے نے دیکھا کہ ماں بیڈ پر بیٹھی قمیض سیدھی کرتے ہوئے پیار سے اس کے باپ کے دوست کو دیکھ رہی تھی جو کہ اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کھڑا تھا۔ بچے نے اس کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کی وہاں اب ہمدردی نہیں بلکہ بیزاری تھی۔ بچہ ماں کو کھڑے ہوتے دیکھ کے بھاگ کر واپس اسی جگہ بیٹھنا چاہتا تھا جہاں ماں بٹھا کر گئی تھی، مگر ایک دم سے پھر اس کی نظریں ماں کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے پیر زمین نے پکڑ لئے، مڑ کر دیکھنے سے ہی انسان پتھر کے نہیں بن جاتے بس "فقط دیکھنے" سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔۔ ماں کی آنکھوں میں پیار کی جگہ ذلت اور شرمندگی نے لے لی تھی، وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس آدمی نے ماں کے ہاتھ پر پیسے رکھے تھے، اور ماں ہکلا رہی تھی "میں تو میں تو۔۔۔"

دوست سینہ تان کے بولا "کوئی بات نہیں یہ میرا فرض ہے، میں آپکی ضرورت کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، آخر آپ کے شوہر کے ساتھ برسوں کی دوستی ہے"

بچہ اس کا احسان اور ماں کی شرمندگی دونوں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے سوچا تو کیا یہ ڈیل تھی؟ اور پیسے تو باپ بھی ماں کو دیتا تھا، مگر ماں کا چہرہ ایسا ذلت بھرا نہیں لگتا تھا۔ تو کیا یہ ڈیل کا حصہ نہیں تھا؟

"میں کچھ دن یہاں رہوں گی اور پھر چلی جاؤں گی"، ماں کی آواز جو ہمیشہ پر اعتماد ہوتی تھی اور اس بچے کو بھی اعتماد کی روشنی بخشتی تھی، آج متزلزل سی کہیں دور سے آتی سنائی دی اور بچے کے جسم میں ایک سنسناہٹ بن کر پھیل گئی۔

"بھابی، میرے بیوی بچے کل پاکستان سے واپس آ رہے ہیں اس لئے آپ اس گھر میں نہیں رہ سکتیں، اسی لئے تو آج ہی۔۔" اس نے ماں کی مٹھی میں دبے پیسوں کی طرف دیکھتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور ماں پھر شرمندگی سے سفید پڑ گئی۔۔۔

ماں کے منہ سے بس "اچھا" نکلا۔

اس دروازے کے اندر ہی شائد ماں نے اپنی کمزوری، ذلت اور شکست کو چھوڑ دیا اسی لئے اپنے گھر واپس آتے ہی وہ سب بھول بھال کر پھر سے ڈکرا رہی تھی اور باپ کے کندھے جھکے ہوئے اور چہرہ کسی سو سال کے بوڑھے کی طرح جھریوں سے اٹا ہوا تھا، انکل کے گھر بچے سے ماں نہیں پہچانی جا رہی تھی، یہاں اپنے گھر واپس آ کر اس کے لئے اپنے باپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔

باپ کو دھڑلے سے گناہ میں برابری کی کہانی سناتے ہوئے ماں کے سینگ اس کے پورے چہرے پر نمایاں ہو گئے اور باپ نے سنتے سنتے اپنی عزت اور عزتِ نفس

دونوں کو وہیں دفن کر دیا۔ اب اس کے چہرے پر شناسا سا ذلت کا رنگ پھیل گیا۔ بچہ اب اس رنگ کو پہچاننے لگا تھا، ماں کی اپنی عدالت کے اپنے ہی انصاف کے فیصلے نے دونوں کے چہرے پر ایک جیسا رنگ پھیر دیا تھا۔۔ذلت کا رنگ۔۔

تو کیا انصاف مکمل ہوا؟ کیا ڈیل ڈن ہوگئی؟ بچے نے دل ہی دل میں اپنے سے سوال کیا۔ کیونکہ اب اس کے سوالوں کے جواب دینے والے اپنی تلاش میں بچے کی آواز سے بہت دور نکل گئے تھے۔

شائد انصاف تو مکمل ہو گیا مگر ساتھ رہنا مشکل ہو گیا۔ بچہ بڑا ہو رہا تھا اور دیکھ رہا تھا ماں نے گناہ میں برابری کر کے بھی دیکھ لیا، باپ کے راستے میں کانٹے چُن چُن کے بھی دیکھ لیا مگر اس کے اندر کی آگ تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پھر ایک اور انکل جن کی بیوی دماغی مریضہ تھی، اس کے ساتھ ماں کو عشق ہو گیا۔ باپ کو احساسِ جرم میں مبتلا کر کے، اس سے جان چھڑا کے، ماں، روز نت نئے عشق میں گرفتار ہونے لگی۔ لوگ باتیں بنانے لگے اور لوگ بھی ایسے ظالم جو باتیں بناتے یہ بھی نہ سوچتے کہ بچہ سن رہا ہے۔ یا شائد اسے سب بچہ سمجھتے کہ بچے کو کیا سمجھ، یہ تو صرف اس کے ماں باپ جانتے تھے کہ وہ بچہ نہیں بلکہ ایک مکمل باشعور فرد ہے۔ لیکن وہ تو اب خود دونوں بچے بنے اپنی زندگیوں سے کھیل رہے تھے۔

باپ ماں سے کہتا "اب تو میرے پاس لوٹ آؤ، اب تو سب حساب برابر ہو گئے، بس ختم کر دو اب سارے قصے کو ۔"

مگر ماں اسے کہتی مجھے تم سے شدید نفرت ہو چکی ہے۔ تم نے میرے اعتماد کو ڈسا ہے اور میں کسی سانپ کو اپنے جسم سے کھیلنے نہیں دوں گی۔

حالانکہ ماں کے نئے عشق کا انجام بھی پہلے جیسا ہی تھا کیونکہ وہ دماغی مریضہ کا شوہر بھی اپنے بچوں اور والدین کے دباؤ سے تنگ آ کر اسے استعمال کر کے چھوڑ چکا تھا، اور ماں اس کے غم میں بال بکھیرے بیٹھی تھی، اسے باپ کی التجائیں کہیں سنائی نہیں دے رہی تھیں، اور نہ اسے باپ نظر آتا تھا۔

کتنے دھوکے اور کھاؤ گی؟ کتنی بار جسم اور روح کو چھلنی کراؤ گی تو میری سزا مکمل ہوگی؟ یہ کوئی سزائے موت تھوڑی ہے جو زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگی؟ باپ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتا اور وہ سرد نگاہوں سے باپ کو تکتے ہوئے کہتی،

"میں اب کہاں جاؤں گی، یہیں پر مروں گی مگر تم اپنے ہاتھ میرے جسم سے دور رکھو مجھے گھن آتی ہے۔ تم چھوتے ہو تو میرے جسم پر سانپ رینگنے لگتے ہیں خدارا! مجھے قبر کے اس عذاب سے دور رکھو۔ مجھے اپنے آپ سے، اپنے بستر سے دور رکھو۔ مجھے دوبارہ زندہ ہو لینے دو، شائد میں کبھی تمھارے کام آ سکوں، مگر ابھی نہیں۔۔ ہٹو پیچھے۔۔ وہ اسے دھتکار دیتی۔۔۔"

اور بچے کو سمجھ نہیں آ رہا کہ ماں نے اس خوابوں کے محل پر پھونک مار کر اسے سویا ہوا محل بنا دیا ہے یا باپ نے؟ جب وہ چھ سال کا تھا تو باپ اس کی ماں سے کہا کرتا تھا اس بچے کے سوال مجھے خوفزدہ کر دیتے ہیں اور آج جب وہ سولہ سال کا ہے تو اپنے سوالوں سے خود خوفزدہ ہے۔ وہ خود سے اور دنیا سے چھپتا پھرتا ہے۔ وہ بچپن میں کبھی بے بی ٹاک نہیں کرتا تھا۔ اب وہ دو بالغ بچوں کو آپس میں چور سپاہی کا کھیل کھیلتے دیکھ دیکھ ہکلانے لگ گیا ہے۔ جملے اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نشے کے ذریعے بچپن کی دیوار پر مکھی بن کر چپک گیا ہے۔ وہاں اسے وہی بچپن کے خواب اور وہی محبت نظر آتی ہے۔

ماں باپ کو جب پتہ چلا کہ وہ نشہ کرنے لگ گیا ہے تو انہوں نے پورا ایک گھنٹہ اس فکر میں گذارا۔۔اور پھر اپنی اپنی جنگ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ وہ ان کی منت کرتا ہے ;

"ایک دفعہ، بس ماں ایک دفعہ وہ خواب سنا دو جنہیں سن کے میں بچپن میں اکتا جاتا تھا، ابا بس ایک دفعہ محبت میں ناانصافیوں کی کوئی دکھی سی اپنی کہانی سنا دو جنہیں سن کے میں چڑ جاتا تھا اور کہتا تھا ابا کیا آپ کی کہانیوں کی کتاب میں کوئی ہنسنے والی کہانی ہے؟ ابا اماں، میں وعدہ کرتا ہوں اب آپ کے خوابوں اور محبتوں کی کہانیوں سے کبھی نہیں اکتاؤں گا ۔"

ماں باپ غصے سے اکٹھے دھاڑتے ہیں؛

"خدا کا واسطہ ہے بڑے ہو جاؤ، خودمختار ہو جاؤ، ہم تمھارے لئے ایک دوسرے کو برداشت کرتے کرتے تھک گئے ہیں، جاؤ اور اپنا سہارا خود بنو۔۔ ہمیں خود سے آزاد کر دو۔"

وہ اور ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک نشہ ہی ہے جو اسے یہ سب سہنے کی طاقت دیتا ہے، وہ خود کو اس میں اور غرق کر لیتا ہے۔

بچہ، باپ کو اسی جگہ کھڑے ماں کا انتظار کرتے دیکھتا تھا تو مطمئن رہتا تھا کہ شکر ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک تو اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔ وہ باپ کو دیکھتا تو سوچتا تھا کہ وہ باپ کے لئے نشے کو چھوڑ دے گا۔ اس کا باپ شائد زندگی پر اعتبار کا آخری سہارا تھا مگر یک دن وہ بھی اپنی جگہ سے سرک گیا اور بچہ زمین پر اوندھے منہ آ گرا۔

جب باپ ماں کو نئی گرل فرینڈ کا بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا:

میں نے تمھیں واپس بلانے کی ہر ممکن کوشش کر لی، میں بھی انسان ہوں اور چاہے جانے اور کسی کو چاہنے کا فطری حق رکھتا ہوں۔ لو بیٹھو تم اب یہیں پر، اپنے جسم کو سنبھال کر۔

اب کوئی سانپ تم پر نہیں رینگے گا، میں نے ایک لڑکی سے دوستی کر لی ہے۔"

کیسا سچا اور غیر منافق گھرانہ تھا، سچائی اس گھر میں ناچتی پھرتی تھی اور انصاف کی لڑائی لڑی جا چکی تھی اور شائد دونوں لشکر ایک دوسرے کو برباد کر چکے تھے۔ یہ پہلی لڑائی تھی جس میں کوئی جیت نہیں تھی فقط ہار ہی ہار تھی۔

بچے نے اپنے تئیں جائزہ لینا چاہا کہ دونوں میں سے کون سا لشکر زیادہ برباد ہے؟ دونوں میں سے کون زیادہ سچا ہے؟ منافق دونوں ہی نہیں تھے، جھوٹا بھی کوئی نہیں تھا، انصاف بھی ہو چکا تھا۔۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ موت ایک دم حسین لگنے لگی۔ سارے خواب اور محبت کا انصاف۔۔ زندگی کی سچائی اور رنگ۔ یہ ہوتا ہے سچ؟ یہ ہوتی ہے محبت؟ اور یہ ہیں زندگی کے خواب اور انکے رنگ۔ ان سب سے اچھی تو موت ہے۔ ان سب سے سچی تو موت ہے۔۔۔ سوچتے سوچتے وہ بس ہر ایک کا منہ تکتا رہتا۔

نفسیاتی مریضوں کے ہسپتال میں، ماں باپ جھنجلائے بیٹھے ہیں، اپنے اپنے سچ کے ساتھ، دونوں کے گلے میں سچ کی مالائیں ہیں، اب جھوٹا صرف وہ بچہ ہے؛

وہ دکھی نظروں کے ساتھ یک زبان ہو کر ڈاکٹر سے کہہ رہے ہیں" ہم بھی کتنے بدنصیب ہیں ایک ہی بچہ ہے او وہ بھی نشہ کرنے لگ گیا۔ حد تو یہ کہ خودکشی کی کوشش کر لی۔ موت کو سچ اور زندگی کو جھوٹ سمجھ لیا ۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں ماں باپ کے لئے ہمدردی ہے اور وہ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے؛

" یکھو! یہ ماں باپ چھوٹے سے بچے کو ہزاروں قربانیوں کے بعد پال پوس کر اس لئے بڑا نہیں کرتے کہ تم ان کی دی ہوئی زندگی کو نشے اور موت میں غرق کر دو۔ یہ زندگی

صرف تمھاری نہیں ہے اگر اپنے لئے جینے کو دل نہیں کرتا تو بھی ینگ مین ان کے لئے جینا پڑے گا۔۔۔"

ماں نے خود پر ترس کھاتے ہوئے فوراً سوچا:

"میں نے اس کے لئے کتنی قربانیاں دیں، اپنے آپ کو مار کے ایک بے ایمان جھوٹے انسان کے ساتھ زندگی گزارتی رہی۔"

باپ نے روتے ہوئے خود کلامی کی؛

"اس بچے کے لئے تو سب ذلت برداشت کی، بے غیرت بن کر چپکا بیٹھا رہا۔ اپنے نفس کو اور عزتِ نفس دونوں کو مار کر اس بچے کی خوشی کے لئے اس رزیل اور خود غرض عورت کے ساتھ رہتا رہا۔ اور دیکھو ذرا اس بچے نے کیا کیا؟ نشے سے خود کو تباہ کر لیا میں نے جو دنیا اس کے قدموں میں جھکائی تھی، یہ کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح ابھی سے زندگی کی بازی ہارنے نکل کھڑا ہوا ہے۔۔ اتنا کمزور نکلا میرا بچہ"۔

بچہ موت سے بچ جانے کے بعد ماں باپ کے چہرے پر پھیلے ہوئے دُکھ کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہا ہے اور اس کا دل کر رہا ہے یہ دونوں اتنا روئیں، اتنا روئیں کہ ان کے چہرے کے نقوش مسخ ہو جائیں۔ وہ انہیں بتانا چاہتا ہے کہ میری کہانیوں کی کتاب سولہ سال کی عمر میں ہی تیار ہو گئی ہے۔ وہ باپ کو اس کا ٹوٹا ہوا وعدہ اور بکھرا ہوا عزم یاد دلانا چاہتا ہے کہ بچے کی کہانیوں کی کتاب میں کوئی دکھ نہیں ہوگا، بچہ اسے یہ اذیت ناک خبر پہنچا کر خوش ہونا چاہتا ہے کہ بچے کی کہانیوں کی کتاب میں سوائے دکھوں کے اور کچھ نہیں ہے اور اس کے خاندان کی اس کڑی سے بھی بد نصیبی غائب نہیں ہوئی، وہ باپ کو بتانا چاہتا ہے کہ اس کا لشکر اپنے خاندان کی محرومیوں کو کبھی ختم نہیں کر سکتا، اس کا لشکر ہار گیا ہے اور پھر اس کے

بعد وہ ان سب شکستوں کا سوگ باپ کے چہرے پر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ سچ بتا کر ہی اسے تسکین ملے گی۔ لڑائی سچ ہی کی ہے تو اس کا سچ بھی سنا جائے۔۔

وہ اپنی ماں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ نسلوں اور صدیوں کا سفر طے کر کے اس کی آنکھوں میں آ کر بسنے والے، ماں کے خاندان کی میراث، وہ سب خواب جل چکے ہیں۔ ماں کے باپ نے جو جگنو اور تتلیاں، اسے سونپی تھیں اور ماں نے بچپن میں اس کی آنکھوں میں بھری تھیں سب مر گئی ہیں اور اب ہر طرف ان کی راکھ اڑ رہی ہے۔ خوابوں کی موت کی خبر سنا کر وہ اس لشکر کی ہار کی خبر دے کر ماں کے چہرے پر پھیلے دکھ سے خوشی لینا چاہتا ہے۔ ماں بھی تو لے سچ کے مزے"

ہاہاہا!!!! اس کی کہانیوں کی کتاب میں ہنسنے کے لئے صرف یہی مواد مہیا ہے۔ ہاہاہا!!!

ڈاکٹر نے خوشی سے ماں باپ کو تکتے ہوئے کہا" مبارک ہو بچہ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے، آپکا بچہ مسکرا رہا ہے، شائد اسے جینے کا کوئی جواز نظر آ رہا ہے"۔

اپنے آنگن کے اجنبی

میرے بچے!! آج تجھے فرصت ہے؟ آج سوچا تجھ سے جی بھر کر اپنے دل کی باتیں کروں۔ جیسے ہی تیرے ابا دنیا سے گئے مجھ سے بات کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ تنہائی نے مجھے سہما دیا تھا اور جب تم لوگوں کے پَروں میں جان آ گئی، دانہ چوگنا خود سیکھ لیا اور اُڑ گئے تو میں اور سہم گئی، کونے میں دُبک کے بیٹھ گئی۔ یہ نہیں کہ تم لوگ اپنی اپنی بولیاں بولنے لگ گئے تھے یا اپنی اپنی اُڑانیں بھرنیں لگ گئے تھے بلکہ اس لئے کہ میں اپنی بولی بھول چکی تھی اور میری اُڑان ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے کونے میں سہم کے بیٹھ گئی، قسم سے تم لوگوں کی اُڑان دیکھ کے تو دل خوشی سے جھوم اُٹھتا تھا۔۔۔۔

یقین جانو مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب میرے سکڑنے کا عمل شروع ہو گیا اور کب میں اتنا سکڑ گئی کہ کسی کیڑے کی طرح دیوار سے چپک کے رہ گئی اور ایسی کمزور ہوئی ہوں کہ ابھی بھی میرے پاؤں پر ایک کیڑا چل رہا ہے مگر سکت نہیں اسے ہٹانے کی، اسی لئے تیری یاد آ گئی تُو پاس ہوتا تو تجھے اشارہ نہ بھی کرتی تو تو سمجھ جاتا۔ تُو ہے ہی بڑا پیارا بچہ، بڑا تابعدار۔۔۔ مگر پاس نہیں ہے نا، اُڑ گیا ہے۔ پاس رہتا تو میرے کہے بغیر میرا خیال کر لیتا۔۔۔ تُو اب صحن میں پڑی بے جان سی ماں کے پاس ہے نہیں نا۔۔۔

مجھ میں ہلنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ آنگن میں رکھی اس چارپائی پر لیٹے لیٹے ایسے ہی شاندار ماضی میں گم ہو جاتی ہوں۔ تم پاس سے گذرتے ہو تو آنکھیں بند کر لیتی ہوں، تم سمجھتے ہو، اماں سو رہی ہے۔ اور بس بغیر مجھے چھوئے آگے نکل جاتے ہو۔

میں اتنی سکڑ جاؤں گی اس کا مجھے کبھی گُمان بھی نہیں ہوا تھا۔ کیسے گُمان ہوتا میں تو اس گھر کی ملکہ تھی۔ تمھارا باپ جس دن مجھے یہاں، اسی آنگن میں بیاہ کر لایا تھا، اس دن سے اس نے مجھے ملکہ ہی بنا کر رکھا تھا۔ لوگ کہتے تھے تم گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہو کہاں کی مہارانی ہو؟ ان جاہلوں کو کون سمجھاتا اپنے گھر کے کام کرنے سے کوئی نوکرانی نہیں ہو جاتا، مہارانی ہی رہتا ہے۔ ہاں اگر تمھارے ابا مجھے دل کی رانی نہ بناتے، مجھے اپنی زندگی کا حصہ نہ بناتے، مجھے مان نہ دیتے، تو میں گھر کے کام کرنے والی ایک مہترانی ہی ہوتی، مہارانی نہیں۔ مگر اللہ انہیں جنتوں میں پیارا سا گھر دے، انہوں نے مجھے اپنی آخری سانس تک دل و جان سے مہارانی ہی سمجھا۔ وہ میری کوئی بات نہ ٹالتے تھے اور نہ ان کی زندگی تک کسی اور کو مجھ سے اختلاف کی اجازت تھی۔

جب تم بچے ہماری زندگیوں کا حصہ بن گئے تو تمھارے ابا نے میرے تاج میں اور بھی محبت، مان اور اعتماد کے نگینے جَڑ دیے۔ وہ کوئی کام مجھ سے پوچھے بغیر نہ کرتے تھے۔ کہتے تھے جان نکلنے کا ڈر نہ ہو تو سانس بھی تم سے پوچھ کے لوں۔۔ میں ایف۔اے پاس، ایک اعلیٰ سرکاری افسر کے اپنے اوپر ایسے انحصار پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اعتماد سے بھر جاتی اور اپنے آپ کو ہلکی پھلکی پتنگ کی طرح ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرتی۔ تم لوگوں کے کاموں میں بھاگی دوڑی پھرتی۔ نہ تھکاوٹ کا احساس ہوتا، نہ اپنے آرام کا خیال آتا۔

تمھیں یاد ہے نا؟ تم سب مل کے مجھے بہت ستاتے تھے۔ مگر پتہ نہیں کیا تھا کہ میں تنگ نہ ہوتی تھی۔ تمھارے ابا کا دیا اعتماد تو تھا ہی، تم لوگوں کو پروان چڑھانے کا ایک الگ ہی مامتا کا فخر تھا۔ جیسے کوئی مصور اپنی تصویروں میں رنگ بھرتا ہے، جیسے کوئی معمار گھر کی تعمیر ایک ایک اینٹ لگا کے کرتا ہے، جیسے کوئی مالی اپنے لگائے پھولوں کو کھلتا دیکھتا ہے، میرا شاہکار، میرا گھر اور میرے پھول تم لوگ تھے۔۔ تم سب، یہ گھر، سب کچھ میرا تھا، میں اس گھر کی پالن ہار یا ملکہ یا مہارانی جو بھی تھی بس بہت خوش تھی۔

تمھارے ابا مجھے تم لوگوں کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگائے بھاگتے دیکھتے تو کبھی بہت ہنستے تھے اور کبھی اُکتا سے جاتے تھے۔ کہتے تھے مُنے کی اماں، کبھی اپنے لئے بھی وقت نکال لیا کرو اور میں لگاوٹ سے کہتی تھی یہی میرے وقت کا بہترین استعمال ہے اور میں نے وقت کو سر پر مارنا ہے۔۔اللہ کی بندی اپنے لئے نہ سہی ہمارے لئے ہی کچھ وقت نکال لیا کرو، یعنی میرے اور تمھارے لئے، الگ سا کوئی سنبھالا ہوا وقت اور میں ان کی یہ بات سنی اَن سنی کر دیتی۔

تم لوگ میری عبادت تھے کوئی اپنی عبادت سے بھی بھلا تنگ آتا ہے؟ یہ عبادت کبھی مشقت نہ لگتی تھی بس اس چارپائی تک مکمل طور پر نڈھال ہو کر پہنچنے تک یہ عبادت عبادت ہی رہی۔ میری زندگی تم لوگوں سے شروع ہو کر تم لوگوں پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اور تمھارے ابا کے سمجھانے پر بھی یہ بات میری سمجھ میں آتی ہی نہیں تھی کہ تم لوگوں سے پَرے بھی کوئی زندگی ہے؟ یہ بات آج بھی، جب کہ میں اس کونے میں سمٹی سکڑی پڑی ہوں، سمجھ میں نہیں آرہی، آج بھی تمھارے قدموں کی چاپ پر، تمھارا وقت مجھ سے باتوں میں ضائع نہ ہو، آنکھیں تو بند کر لیتی ہوں مگر دل اسی چاپ کا منتظر رہتا ہے۔ گھر کے بڑے دروازے سے تمھارے بیڈ روم تک تمھارے قدموں کی چاپ کے گرد ہی زندگی گھوم رہی ہے۔ آج بھی بند آنکھوں کے پیچھے سے تم سے ہی ہمکلام ہو۔ تمھارے ابا کی روح قبر میں اب بھی مجھ سے پوچھ رہی ہوگی۔۔اللہ کی بندی کیا آج بھی اپنے بیٹے سے ہی باتیں کرے گی؟

مُنے تو جانتا ہے نہ تیرے ابا بھی تجھے کتنا پیار کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے میری ساتویں حس مجھے بتاتی ہے کہ یہ لڑکا ہی بڑھاپے میں ہمارا سہارا بنے گا۔۔ میں ساتویں حس کا لفظ سن کے ہنس دیتی۔۔ چھٹی تک تو سنا ہے ساتویں کیا ہوتی ہے؟ مگر جو بھی ہوتی ہوگی ٹھیک ہی ثابت ہوئی، دیکھو، اجل نے انہیں تو موقع نہیں دیا کہ اپنی ساتویں حس کو سچ ہوتا دیکھ سکتے مگر میں تمھاے سہارے سے اپنے بڑھاپے سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو رہی

ہوں، تمھارا دیا کھاتی ہوں، تمھارے گھر (جو کبھی ہمارا تھا) کے کونے میں پڑی ہوں۔ تمھارے ابا کی پیشن گوئی کتنی سچی تھی۔

جب ابھی اتنا نہ سکڑی تھی کہ چلنے سے ہی معذور ہوتی، تو ایسے ہی کبھی بے دھیانی میں تمھاری بیوی کی سہیلیوں کے سامنے آجاتی تھی تو ان کی آنکھوں میں اُلجھن دیکھ کر تمھاری ذہین بیوی جھٹ سے کہتی تھی، "بڑا فائدہ ہے ان کا، بچے جب چھوٹے تھے انہیں کہانیاں سناتی تھیں، ورنہ تو تم لوگوں کو پتہ بچے رات کو سونے سے پہلے کتنا تنگ کرتے ہیں، بھئی میرے شوہر تو مجھے مار ہی دیتے اگر رات کو میں بچوں کو سلانے کی کوشش میں نڈھال ہو کر ان کے پاس پہنچتی۔۔بڑا فائدہ دیا انہوں نے"۔۔

تمھارے ابا کی یاد آجاتی تھی جو کہتے تھے اللہ کی بندی ہمارے لیے کون سا وقت ہے؟ ان کے حصے تو میرا وقت کبھی نہ آیا مگر پھر وہ وقت تمھارے بچوں کو کہانیاں سنا کر دینے لگی۔ مگر ایک دن وہ وقت بھی بے وقعت ہو گیا جب تمھاری چھوٹی بیٹی نے کہا:

گرینی آپ کی کہانیاں بہت آؤٹ ڈیٹڈ ہوتی ہیں، مت سنایا کریں تو میرے بچے اُس دن تیرے ساتھ لگا میرا ایک اور ٹانکا ٹوٹ گیا اور میں مزید سکڑ گئی۔

پتہ نہیں کیا تھا تمھاری بیوی کو ہر دوسرے دن اپنی کسی نئی ملنے والی کو میرے وجود کا کوئی نہ کوئی فائدہ بتانا پڑ جاتا تھا، "یار بزرگوں کی بڑی برکت ہوتی ہے، ہم گھر پر نہ ہوں تو فون پر میسج بھی لے لیتی ہیں"۔

اور مجھے بھی اپنی برکت بس اسی وقت نظر آتی ورنہ تو اس گھر میں ایک ہی آواز مجھے آنے لگ گئی تھی "اوہ اللہ آپ کیا کرتی ہیں؟ آپ کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، جب سمجھ نہیں آتا تو نہ بولا کریں۔ یہ آپ کا چھوٹے سے ریڈیو والا زمانہ نہیں ہے یہ کمپیوٹر دَور ہے، دنیا سکڑ کے اس کمپیوٹر میں آگئی ہے" اور میرے بیٹے میں ڈرائنگ روم میں دھرے اس ڈبے کو جسے وہ کمپیوٹر کہہ رہی تھی دیکھ کے میں مزید سکڑ گئی۔

بس تیری بیوی دنیا کی طرح مجھے بھی سکیڑنا چاہتی تھی، نیند کی گولیاں کھا کے سونے سے منع کیا تو غصے میں آ گئی۔۔" کیا کرتی ہیں اماں، توبہ!! آپ کے زمانے میں لوگ لسی پی کر سوئے رہتے تھے، آجکل لوگ بلیک کافی پیتے ہیں اور ساری ساری رات ان کا دماغ ورکنگ حالت میں رہتا ہے، اب ایسے ہی سویا جا سکتا ہے"۔ میں پھر اپنی کم علمی کی وجہ سے سہم کے پیچھے ہٹ جاتی۔

گھر میں اس کا کوئی ملنے والا آ جائے یا ہمارے رشتہ دار وہ مجھ تک کسی کو پہنچنے نہیں دیتی تھی۔ اور ایک وہ وقت تھا جب میں پانچ منٹ چپ کر کے کہیں پڑنے کو ترستی تھی، تم چاروں میرے پیچھے بلی کے بلونگڑوں کی طرح چیاؤں چیاؤں کرتے پھرتے تھے۔ ایک دن میرے سر میں بہت درد تھی اور پورے گھر میں ایک بھی ایسا کونہ نہیں تھا جہاں مجھے سکون سے تم لوگ علیحدگی میں ایک گھنٹہ بھی آرام کر لینے دیتے اس دن پہلی دفعہ میں نے تمھارے ابا کو کہا تھا

یہ لوگ کبھی چین نہیں لینے دیتے، مر بھی جاؤں گی تو اٹھا کے کوئی کام بتائیں گے۔۔

وہ بہت ہنسے تھے کہنے لگے" نیک بخت تو اس گھر کی رونق ہے، تو اس بات سے خوش ہوا کر کہ تیری سب کو ضرورت ہے، تیرے بغیر اس گھر کا پہیہ جام ہو جاتا ہے، تُو حرکت ہے اس گھر کی، تیرے دم سے رونق ہے، تیرے بغیر سب ادھورے"۔۔ میں یہی سننا چاہتی تھی، میرا اندر جھوم اٹھا، رونق، ضرورت، حرکت۔۔ میں یہ سب تھی۔

مگر ایک دم کیا ہوا؟ کیسے میرا وجود بے رونقی میں ڈھل گیا؟ کیسے میری ضرورت کم ہوتے ہوتے اس چارپائی پر آ کر ختم ہو گئی؟ مجھ سے بات کرنا مجھ پر احسان کرنا کب سے ہو گیا؟ اور جب اس چارپائی پر ناکارہ پُرزے کی طرح پڑی ہوں تو گھر کا پہیہ اب تک جام کیوں نہیں ہوا؟

یہ نہ سوچ کہ میں کوئی گلہ کر رہی ہوں مجھے شائد یاد نہیں رہا۔۔ ہاں میں تو ابھی بھی

ناکارہ نہیں ہوں، ہاہا!! ہاں یاد آیا تیری بیوی اپنی دوستوں کو میری افادیت بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ "بڑی بی بڑے کام کی ہیں، ہم گھر نہ ہوں تو خوب نگرانی کرتی ہیں"۔۔ مگر تمھاری بیوی کی دوستیں بہت تیز ہیں شائد بلیک کافی پی کر کمپیوٹر کے زمانے میں لوگ ایسے ہی ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے ہیں، مگر وہ دوست تو بہت ہی کمینی نکلی تجھے پتہ ہے تیری بیوی کو نیچا دکھانے کو کیا کہتی ہے؟ تجھے کیسے پتہ ہوگا، تجھے پتہ چل جاتا تو تو اس کا منہ نہ توڑ دیتا۔۔

نامراد کہتی:

"ارے ساس رکھنے کی یہ کون سی وجہ بتا رہی ہو، یہ کام تو میرا کُتا زیادہ اچھے سے کرتا ہے"۔ تُف ہے اس پر، مگر تیری بیوی بھی شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ سہیلیوں کو گھر میں میرے بے کار وجود کی کوئی ٹھوس دلیل نہ دے سکی تھی، اور کتا بازی لے گیا۔

میرے بیٹے یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے گلہ کر رہی ہوں، تمھاری بیوی کا احسان ہے مجھ پر کہ اس نے اتنی سبکی کے بعد بھی مجھے اسی گھر میں رہنے دیا ہے، یا تمھیں اسی گھر میں میرے پاس رہنے دیا۔ ورنہ دیکھو میرے باقی بچے تو ایسی ہی ذلتوں کے خوف سے اپنا دامن مجھ سے چھڑا چکے ہیں۔ تم بھی چھوڑ جاتے تو میں کیا کر سکتی تھی؟ یا تم مجھے اس گھر سے نکال دیتے تو میں کیا کر سکتی تھی؟ اسلئے بڑا احسان ہے تمھاری بیوی کا مجھ پر، نہیں کسی سے بات کرنے دیتی تو نہ سہی۔۔ نہیں میری بات سنتی تو نہ سہی۔۔۔

آج ایسے ہی ان بند آنکھوں کے پیچھے سے خیال آ رہا ہے کہ تم سے ڈھیر سی باتیں کروں۔۔ یاد ہے! تمھارے ابا کہا کرتے تھے کہ بھلی لوک یہ گھر تیرا ہے، یہاں پتہ بھی تیری مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ تُو ملکہ ہے اور میرا پہنایا ہوا یہ تاج تیرے سر سے کوئی نہیں اتار سکتا۔ مگر یہ کیا؟ وہ یہ وعدہ وفا نہ کر سکے، ساتھ چھوڑ گئے، ان کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی تاج دھڑام سے زمین پر آ پڑا۔ اور میری سلطنت پر رہا سہا باقی کا قبضہ اس دن ہو گیا جس دن تم تینوں کی دلہنیں بیاہ کر آئیں اور میری اپنی بیٹی رخصت ہو کر چلی گئی۔ میرے گھر کا

ایک رنگ تھا مگر اس پر اندر اور باہر سے اور طرح کے رنگ چڑھنے لگے۔ میں نے گھر کا اصل رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔۔ میرے سکڑنے کے عمل کے ساتھ ساتھ رنگوں کا یہ کھیل بھی جاری رہا۔ اور آج جب میرا سکڑنے کا عمل بھی مکمل ہو چکا ہے اور میرا کوئی رنگ باقی نہیں بچا۔ اس گھر کو بدرنگا تو نہیں کہوں گی کیوں کہ اب یہ تمھاری بیوی اور بچوں کے رنگوں سے سجا ہوا ہے مگر سوچتی ہوں کیا تو کبھی پرانے رنگ تلاش کرنے میری چارپائی تک آئے گا؟

آج تمھارا نہیں نہیں! تمھاری بیوی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ میں آج بھی اسی گھر میں ہوں جہاں میری ڈولی آئی تھی۔ اس گھر کی دیواروں پر تمھارے ابا کے ساتھ گذارے ہوئے دن، تم لوگوں کی بچپن کی کلکاریاں، شرارتیں، لڑکپن کی چاہتیں، جوانی کے خواب اور میری اپنی جوانی کے دن سب کے عکس ہیں، اب یہ سب سامان میں نے تکئے کے نیچے پوٹلی بنا کر رکھ چھوڑا ہے، اس امید کے ساتھ کبھی تو تُو یہ سامان لینے آئے گا مگر اب تمام دن پَر لگا کے اُڑ گئے ہیں اب اگر تُو آیا بھی تو میرے ہاتھوں میں شائد اتنی بھی جان باقی نہیں کہ تکئے کے نیچے سے سامان یا دیوار پر بکھری ہوئی یادوں کو اُتار کر تیرے سپرد کر سکوں۔ تو میرے ساتھ میرے "ماضی کے دروازے" سے داخل نہیں ہونا چاہتا، مجھے اپنے اپنے "حال" میں ساتھ چلنے نہیں دیتا۔ گلہ نہیں کر رہی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ تو نے مجھے اس گھر میں رہنے دیا جو کبھی میرا تھا، جس کی کبھی میں ملکہ تھی۔۔۔۔

یاد ہے اس گھر میں میرے بنائے ہوئے قانون چلتے تھے۔ تیرے ابا نے کہہ رکھا تھا "یہاں وہی ہوگا جو یہ کہے گی"۔ یہ قانون کتاب سمیت کب غائب ہو گیا کچھ خبر نہ ہوئی۔ کڑیاں ملانے لگوں تو شائد پہلی ضرب تب لگی تھی جب تیری بہن نے اپنی شادی کے بعد میری کسی نصیحت کے بدلے تُنک کے کہا تھا:

"اوہو اب تو بس کر دیں اماں، میرے سسرال میں یہ سب نہیں چلتا، وہ ماڈرن لوگ

ہیں۔ آپ نے ساری عمر ہمیں دبا کے رکھا اب تو سانس لینے دیں"۔ میں یہ سنتے ہی سکڑ گئی۔۔ اس کے بعد گھر سے میرا رنگ اترنے اور میرے سکڑنے کا عمل میری بے خبری میں تیزی سے جاری رہا۔

تیری ماں ہوں۔۔ جس تباہی کی خبر مجھے نہ ہو سکی تھی، اس کی خبر تجھے دینا چاہتی ہوں۔ سوچ ذرا میں جو ڈھٹائی سے جیئے جا رہی تھی، اتنی نڈھال اور بدحال کیوں ہو گئی ہوں؟ آج تیرے قدموں کی چاپ پاس سے گزر گئی تو حرفِ شکایت بند آنکھوں کے پیچھے آنسو بن کر کیوں رڑکنے لگا ہے؟ بتاتی ہوں۔۔۔ میں جب سے سمٹ کے بیٹھی ہوں میرا سارا جسم آنکھ بنا بیٹھا ہے اب صرف دیکھ سکتی ہوں، تیرا چہرہ دیکھتی ہوں جو اب بدرنگ اور برباد لگتا ہے۔ تیرا اکیلا پن دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں تو اس دنیا میں کیا کما رہا ہے؟ تیرے باپ کو تجھ پر بڑا مان تھا، کہتا تھا بڑا ذہین بڑا فرمانبردار سپوت ہے۔ میں بھی تیرے بڑے لاڈ اٹھاتی تھی، سب سے اچھی چیز تیرے لئے چُھپا کر رکھ لیتی تھی۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے تو محلے بھر اور خاندان والوں، سب سے پیار لیتا تھا۔ مگر یہ کیا؟ ایک دن میں نے سنا تیرا بیٹا تیرے ساتھ اس بات پر لڑ رہا تھا کہ تو نوکری چھوڑ دے اور بزنس کرے۔ وہ کہہ رہا تھا "پاپا آج کل کون نوکری کرتا ہے؟ پیسہ بنانے کے لئے اچھا بزنس ضروری ہے"۔ تو دھیرے سے بولا تھا "بیٹا ساری عمر نوکری کی ہے اب اس عمر میں کیا بزنس کروں گا"۔۔

"بس مجھے کچھ نہیں پتہ آپ ریٹائرمنٹ لیں اور بزنس شروع کریں، میرے سب دوستوں کے پاس نئی نئی گاڑیاں ہوتی ہیں اور میرے پاس سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل، سب برینڈڈ کپڑے پہنتے ہیں اور ماما ہمارے کپڑے خریدنے کے لئے یہاں بیٹھ کر سیلز کا انتظار کرتی ہیں۔ میری عزت کی آپ کو کوئی فکر نہیں جو اتنی گھٹیا نوکری کر رہے ہیں"؟

گھٹیا نوکری؟ تمھاری سہمی سہمی آواز جس میں اسی طرح حیرانی گھُلی ہوئی تھی جس طرح میری آواز میں شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر گھلتی تھی۔ ابھی تم اپنے بچے کے اس حملے

سے پوری طرح سنبھلے نہیں تھے کہ تمھاری بیوی کی پاٹ دار آواز نے تمھیں لرزا دیا۔۔

" کیا بچوں کی ساتھ بحث میں پڑ جاتے ہو؟ ان کے لئے ہی ہم سب کچھ کر رہے ہیں تو انکی خوشی کا بھی تو دھیان رکھو، اپنی دقیانوسی باتیں چھوڑ دو، وہی کرو جو بچے کہتے ہیں۔ جوان اولاد کے منہ نہیں لگتے"۔

تیری بیوی کا جملہ دو دھاری تھا، ایک طرف تم کٹ گئے اور دوسری طرف اس کا بیٹا اپنی جوانی کی طاقت پر نازاں، باپ کو اور دبانے کے لئے تیار، ماں کے گلے میں بازو ڈال کر کھڑا ہو گیا اور تیری بیوی نے اُسے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، "دیکھ میں تیرے ساتھ دوڑنے کے لئے تیز رفتار، تازہ دم ماں ہوں، چھوڑ اس ہلکان ہوتے بڑھے باپ کو۔۔ مجھے دیکھ میں کیسی تیز رفتار ہوں"۔

تُو بیٹے اور بیوی کی سازش کا شکار ہو گیا۔ اپنی جدت اور رفتار کے ساتھ ساتھ ان کے لئے اپنی محبت ثابت کرنے کو تو بزنس کی آگ میں کود گیا۔ جب تو ریٹائرمنٹ کے پیسے لے کر گھر آیا تھا تیرا بڑا جاندار استقبال ہوا تھا۔ سب نے تجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ مگر میں جہالت کی ماری ہلکے سے پکاری تھی۔۔

"بیٹا تو نے ساری عمر نوکری کی ہے، لگی بندھی روزی کو ٹھوکر نہ مار، بزنس کا تجھے کچھ تجربہ نہیں ہے"۔۔ تو نے بیوی بچوں کے خوشی سے دمکتے چہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ پر قہر آلود نظر ڈالی تھی اور کہا تھا۔۔" خدا کے واسطے اماں خوش ہونا سیکھ لیں۔۔ وہ نہیں سیکھنا تو کسی اور کو خوش ہوتے دیکھ کر برداشت کرنا سیکھ لیں۔ اور آپ ان باتوں میں کیوں بولتی ہیں جن کا آپ کو پتہ ہی نہیں"۔۔ میں دُبک سی گئی۔۔ ہاں، مجھے تو کسی بات کا پتہ نہیں۔ مجھے تو یہ تک نہیں پتہ کہ خوشی کے موقعے پر صرف خوش ہونا ہوتا ہے۔ گھر میں بیٹا نوٹوں کی بوری لایا تھا، سب خوش تھے تو میں کس بات کا ماتم منا رہی تھی؟

تجھے تو اس بات کی بھی خبر نہیں کہ تیرا کام بہت عرصے سے اس گھر میں صرف رقم دینا رہ گیا ہے۔ تو چیک کاٹتا جاتا ہے، وہ خرچ کرتے جاتے ہیں۔ تیری بیوی اور تیرے بچے اس وقت تجھے ڈھونڈتے ہیں جب انہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تو بھی میری طرح خوش ہو جاتا ہے کہ تو اس گھر کا مرکز، تیرے بغیر یہ گھر ادھورا۔۔۔۔ میں جو، اب سکڑی سمٹی ایک کونے میں دبکی بیٹھی ہوں انہی سب گلیوں سے ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔ اپنی خبر نہیں ہو پائی تھی، مگر تیرا گھٹنا، سب نظر آ رہا ہے۔

تو بچپن سے ہی بھولا سا تھا آج بھی تجھے خبر نہ ہوئی جب تیری بیٹی کا رشتہ دیکھنے والے آئے۔ تیری ماں نے بیٹی اور اپنے جوان بیٹے سے مشورہ کیا، مشورہ کیا؟ ان کی آنکھیں پڑھیں اور ہاں کر دی۔ تو نے کچھ بولنا چاہا تو بیٹی نے تیرے گلے میں باہیں ڈال کر کہا" پاپا میں نے زندگی گذارنی ہے جب مجھے لڑکا پسند ہے تو آپ کو کیا پرابلم؟"۔ تم نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا وہ لاپرواہی سے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ تُو ہکلاتے ہوئے بولا "نہیں بیٹا مجھے کیا پرابلم؟ جس میں تم خوش" اور بیوی کے یاد کرائے ہوئے الفاظ دہرا دئے تھے۔۔"

آخر یہ سب محنت میں تم لوگوں کی خوشی کے لئے ہی تو کر رہا ہوں"۔۔۔ یہ کہتے ہوئے تُو نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ بزنس میں تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے تجھے گھاٹے پڑنے لگے۔ تیرا وجود تیرے گھر والوں کے لئے تیرا بنک اکاؤنٹ خالی ہوتے ہی، ناکارہ ہو گیا۔ دوسری طرف اب تیرے بچے، تیری بیوی سب کمانے لگ گئے۔ تمھاری جسامت ایک دم سے گھٹ گئی۔ میں جس مقام تک سالوں میں پہنچی تھی، تو دنوں میں وہاں پہنچ گیا۔

تمھاری بیوی جب کمانے لگ گئی تو جو تم دونوں کے درمیان ایک سرسری سا ضرورت کا

رشتہ تھا، وہ اور بھی برائے نام سا لگنے لگا۔ وہ جب اپنی ضرورت خود پوری کرنے لگ گئی تو اس نے تمھیں دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ اس جدت نے تمھیں کیا دیا؟ تمھیں اپنا کام کرنے کی آزادی، بیوی کو اپنا۔۔۔

بچے!!! اس آزادی سے تمھارا دم گھٹ نہیں جاتا؟

تمھیں یاد ہوگا میں اور تمھارے ابا کتنے فرسودہ اور کم عقل ہوتے تھے کہ کبھی ایک دوسرے سے ایک گھنٹے سے زیادہ ناراض نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم نے ہمیشہ کھانا اکھٹے کھایا، اگر ناراضگی ہوئی ہوتی تو اس کے ختم ہونے تک ایک بھی نوالہ ہمارے حلق سے نہ اُترتا تھا۔

کتنی وہمی اور جاہل تھی میں کہ تمھارے ابا کام سے کبھی لیٹ ہوجاتے تھے تو میں دروازے کے اتنے چکر کاٹتی تھی کہ پورے محلے کو پتہ چل جاتا تھا کہ آج منے کے ابا لیٹ ہوگئے ہیں۔ اب تم لوگوں کی خودمختار زندگیاں دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کیا پتہ تمھارے ابا کا میری اس محبت میں دم ہی گھٹتا ہو؟

ایک دوسرے کو آزادی دینا، یہ تو میں نے تمھاری بیوی سے سیکھا۔ ایک دن میں اس سے تمھارا پوچھ بیٹھی، وہ ایسے چلائی لگا جیسے کسی نامحرم کا پوچھ بیٹھی ہوں۔

"مجھے کیا پتہ اماں وہ کہاں ہیں؟ میں کیا اسکی جاسوسی پر ہوں؟ یا اس کی چوکیدار ہوں؟
"

"نہیں بیٹا ایسے ہی"۔۔۔۔۔ میں شرمندہ ہو کے نکل آئی تھی۔۔

تم بھی دنیا جہاں سے بے خبر کمپیوٹر میں سر دیئے بیٹھے رہتے ہو، تمھیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بیوی تمھارے آس پاس نہیں ہے۔ تمھیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بچے تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں یا نہیں۔۔۔

بچوں کے قد تم سے لمبے ہوگئے تو تم مزید سکڑ گئے مگر تمھاری بیوی اور بھی تگڑی ہوگئی۔

وہ اپنے آپ کو تم سے برتر ثابت کرنے کے لئے، بچوں کی پیاری ماں بننے کے لئے، بچوں کے رنگوں والے تالاب میں چھلانگ لگا چکی ہے۔ بچے اسے بتاتے ہیں تو وہ تمھیں ایسے بتاتی ہے جیسے بچے اس سے پوچھ رہے ہیں۔ بتانے اور پوچھنے کے فرق کو وہ تمھاری آنکھوں سے اوجھل رکھتی ہے۔ یہ نہیں کہ میں ساس ہوں تو اس کا مورنی کا ناچ آنکھوں میں چبھن پیدا کر رہا ہے میں ماں ہوں اس لئے یہ آزادی اور space کے نام پر تمھیں ایک لنگڑا رشتہ نبھاتے دیکھ کر کڑھتی ہوں اور تجھے خبر دینا چاہتی ہوں کہ تیرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

تم میاں بیوی کا آپس میں کوئی مان، کوئی حق کوئی محبت کچھ بھی نہیں بلکہ صرف انڈر سٹینڈنگ، اور آزادی۔ میں تمھارے ابا کو کسی عورت کے ساتھ بات کرتے بھی دیکھ لیتی تو آگ بگولہ ہوجاتی تھی یہ تم لوگوں کی ڈکشنری میں "قید" ہے تو یقین مان تیرے ابا اس "قید" میں بہت خوش رہتے تھے مگر تو ایسی قید کی لذت سے محروم ہے۔۔ تیری بیوی کے سامنے ایسا کچھ ہوجائے تو کہتی ہے" میں کیا کروں، میں بھی تو آدمیوں سے بات کرتی ہوں اماں ہماری آپس میں انڈرسٹینڈنگ ہے"۔۔۔ اسے نہیں پتہ یہ چیزیں ناپ تول اور حساب کتاب یا ادلے بدلے سے نہیں ہوتی ہیں۔۔ یہ تو بس بیویوں کا حق ہوتا ہے، ان کے مرد پیار سے انہیں یہ حق دیتے ہیں۔

میری زندگی میں ان کی ذات کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ میری ذات کا محور تھے۔ کسی دن میں تیرے ابا کی کسی چیز میں دلچسپی نہ لیتی تھی تو وہ پھیکے پڑ جاتے تھے۔ اور اگر تیری بیوی جتنی آزادی میں انہیں دے دیتی تو وہ تو مر ہی جاتے۔۔۔ اور تیری بیوی والی آزادی مجھے ملتی تو میں کتنے دن جی پاتی؟

تم دونوں اس ماڈرن رشتے کی وجہ سے زندگی میں ساتھ ساتھ بھاگ تو رہے ہو مگر تم دونوں کا کہیں ملاپ نہیں ہے۔ اس غیر فطری رشتے نے بچوں کو بھی سرد مہری دے دی ہے۔

تیری بیوی ان کے آگے پیچھے بھاگتی رہتی ہے سمجھتی ہے دنیا میں جینے کا یہی طریقہ ہے۔

تو ایک " پیارا سا پاپا" اور " انڈرسٹینڈنگ شوہر " بن کر رہ گیا ہے۔ تیرا نام تعارف کے لئے استعمال ہوتا ہے اور تو سر جھکائے نجانے کمپیوٹر میں کیا ڈھونڈتا رہتا ہے؟ تو ان القابات سے خوش کیوں نہیں ہوتا؟ بلا وجہ سینہ پھلانے کی کوشش کیوں کرتا ہے؟ تمھیں ایسا کرتے دیکھ کے مجھے تم پر ترس آنے لگتا ہے اور میرا سینہ پھٹنے لگتا ہے۔

تو سمجھتا ہے ماں اپنے رونے رو رہی ہے۔۔ نہیں! میرے بیٹے میں تو ان بند آنکھوں کے پیچھے سے تجھے اپنی جگہ آتا دیکھ رہی ہوں اور تم کو تمھاری جگہ پر اجنبی ہوتا دیکھ رہی ہوں
۔

تمھیں وہ دن یاد ہیں جب ہم اس آنگن کے باشندے تھے، اپنی موج میں بہتے تھے۔ بڑی تازہ ہوا آتی تھی۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور کھلکھلاتے تھے۔ اس آنگن میں کتنے ہی پودے ہم نے مل کے لگائے تھے۔ ہمارے اوپر سورج بہت نرمی سے چمکتا تھا، جھلساتا نہیں تھا۔ کتنے پرندوں کو ہم نے اس آنگن میں باجرہ ڈالا تھا، اب وہ درخت پر آ کر بیٹھتے ہیں اور ناراض ناراض سے مجھے تکتے ہیں۔۔ وہ سمجھتے ہیں میں ان کو بھول گئی، میں ان کو کیسے بتاؤں کہ جاؤ اس آنگن میں پلٹ پلٹ کر نہ آیا کرو۔ یہ آزادی کا زمانہ ہے، تم بھی اspace لو۔ انہیں آزادی کیوں نہ دیتی اب اس گھر میں یہی رواج چل رہا ہے۔

میرے جانے کے بعد کبھی تم یہاں بیٹھے ہو اور وہ تم سے یہی سوال کریں تو انہیں بتا دینا۔۔ ماں تمھیں نہیں بھولی تھی، بس اتنا سکڑی کہ اپنے آپ کو ہی بھول گئی تھی ماں تمھاری آزادی کو انڈرسٹینڈ کرنے لگ گئی تھی۔۔ بس چپکے سے انہیں بتا دینا، مجھ سے تو ناراض ہیں، میری بات نہیں سنتے۔

کل تم آنگن میں میری لگائی ہوئی بیری کے نیچے سر جھکائے بیٹھے تھے، خدا کی قسم تمھیں پہچان ہی نہیں پائی، یوں لگا کوئی اجنبی بیٹھا ہے، غور سے دیکھا تو پتہ چلا اجنبی تو تم ہی ہو گئے ہو، بالکل میرے جیسے۔

مگر ابھی میں زندہ ہوں ابھی میرے سامنے میرے جیسی شکل لے کر مت آیا کرو۔ اب تمھاری چاپ پاس سے گزرتی ہے تو اس لئے آنکھیں نہیں بند کرتی کہ تمھارا وقت نہ ضائع ہو بلکہ اس لئے آنکھیں موند لیتی ہوں کہ تمھاری یہ شکل نہیں دیکھ پاتی۔ اس گھر میں تمھارے ابا کی آواز آج بھی میں سن سکتی ہوں۔ تم لوگوں کی چہکاریں ابھی بھی کانوں میں گونجتی ہیں۔۔

میرے پاس اس آنگن میں اجنبی نہ ہونے کے بہت سے بہانے میری مامتا کے آنچل میں چھپے ہوئے ہیں مگر پھر بھی مجھے اجنبی ہونے سے کوئی چیز نہیں بچا سکی۔

تو میرا بڑا پیارا فرمانبردار بچہ ہے۔ بس میرا ایک آخری مان رکھ لینا میرے جانے کا انتظار کر لینا۔ اس سے پہلے میری طرح اس گھر کا کوئی کونہ آباد نہ کرنا ٹھہر جانا ذرا، رُک جانا۔۔ میری موت سے پہلے مجھے یہ موت کا منظر نہ دکھانا۔

یہ آنکھیں بہت کچھ سہ سکتی ہیں مگر یہ نہیں۔ اس آنگن میں ایک اجنبی کے ہوتے ہوئے دوسرے اجنبی کو کونے کے خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔۔ بول مان لے گا یہ بات؟ یا پھر سے کہہ دے گا اماں تُو چُپ کر تجھے کچھ پتہ نہیں چلتا؟

موت کے بعد رہ جانے والا گھر

میز کے اوپر دھرا خالی گلاس جو اُس کروشئیے کے رومال سے ڈھکا ہوا ہے جس کے دھاگوں میں مرنے والی کے ہاتھوں کے نشان ابھی بھی پائے جاتے ہیں۔ کچھ دن پہلے تک باورچی خانے میں وہ کھڑی ہو کے کھانے میں چمچ ہلاتے ہوئے اپنے ان خوابوں کو سوچتی تھی جن کی تکمیل کی خاطر اس کے پورے وجود میں غصہ بھر گیا تھا۔ اُن خوابوں کے آنکھوں میں ٹوٹنے کا غصہ اور زندگی میں ملنے والے چھوٹے چھوٹے دھوکوں کا بوجھ باورچی خانے کے برتنوں سے اس کے جنازے کے چلے جانے کے بعد بھی جھانک رہا تھا۔ یہیں کھڑے کھڑے اس نے زندگی کے جتنے پل مرمر کے گذارے تھے وہ سب لمحات ابھی تک کسی آسیب کی طرح دیواروں سے چمٹے ہوئے تھے، اور پیچھے رہ جانے والے گھر کے افراد کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈال رہے تھے۔

وہ انہی دیواروں کو تکتے ہوئے سوچا کرتی تھی کہ کیسے یہ گھر دنیا میں سب سے پیارا گھر بنے گا؟۔ دیواروں پر ہوئے پینٹ میں ابھی تک اس کی محنت کے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ فرش پر بچھے قالین نے اس کے جانے کے بعد وہ سارے بے آواز آنسو اُگلنے شروع کر دئے تھے جو وہ یہاں بہاتی رہتی تھی، کسی کو وہ آنسو نظر بھی آجاتے تو سنائی نہ دیتے تھے۔ اس قالین نے اس کے جانے کے بعد راز اگلنے شروع کر دئے تھے۔ باتھ روم سے وہ سسکیاں سنائی دینے لگ گئیں جو وہ وہیں ٹوتھ برش اور پیسٹ میں چپکی ہوئی تھیں۔

مرحومہ کے کپڑوں کی الماری کھولی گئی تو اندر سے تبدیلیوں کے وہ تمام مراحل برآمد ہونے لگے جو اس کے وجود نے جوانی کے ان تمام سالوں میں طے کئے تھے۔ زندگی کے جوش کو کم کرنے کے لئے جس دور میں وہ کالا سوٹ پہنتی تھی، وہ دور الماری میں ہینگر پر لٹک رہا تھا اور اس کے اوپر سنہری نگوں کا کام تھا۔ یہ زندگی کا وہ دور تھا، جب محبتوں پر اور رشتوں پر مرنے والی کو یقین تھا۔ وہ کہنے والوں کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی اور زندگی کو مٹھی میں پکڑ کر جوش سے چلاتی تھی "ہم سا ہو تو سامنے آئے" اور اس کے جوش اور دبدبے کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا تھا۔

اِس گھر کی تعمیر کے لئے جو اب اُس کے مرنے کے بعد اکیلا رہ گیا ہے، اس نے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے تھے۔ وہ تنہا مزدوروں سے کھڑے ہو کے کام کرواتی تھی اور جب انہوں نے اس گھر کی بنیادیں رکھیں تو وہ غلطی سے اینٹیں رکھتے ہوئے اس کے خواب نکالنے بھول گئے۔ جیسے جیسے اینٹوں کی دیوار اونچی ہوتی گئی، خواب گہرائی میں اترتے گئے۔ ان کے اوپر بہت سا گارا، بہت سی مٹی اور بہت سا سیمنٹ آ گیا۔ اسے نہیں پتہ تھا خوابوں کا بہت سی مٹی کے نیچے دب جانے کا مطلب آدھی موت ہوتا ہے۔ وہ گھبرانے والوں میں سے نہیں تھی۔ پرانے خواب نظروں سے اوجھل ہوئے تو اس نے انہیں یکسر فراموش کر کے نئے گھر کے ساتھ آنکھوں میں نئے خواب بننے شروع کر دئے۔

اب الماری میں سے اس کا سرخ جوڑوں والا دور برآمد ہوا، اس دور میں زندگی کی حقیقت اس پر کھل گئی تھی اور وہ رشتوں کی بناوٹ اور منافقت سے اوب گئی تھی۔ سچ کی تلاش سے تھک کر اندر سے مدھم ہو رہی تھی۔ اس مایوسی اور کرب کی چبھن نے جو چڑچڑاہٹ کا تحفہ دیا تو اُس نے اسے سرخ رنگ میں چھپا لیا۔ ہینگر میں لٹکے سرخ کپڑے رونے کے بعد اس کی آنکھوں کے لال ڈوروں کو عریاں کرنے لگ گئے۔

وہ اس گھر میں تھی تو الماری کا دروازہ بند رہتا تھا، اس کے مرنے کے بعد الماری ہر خاص و عام کے لئے کھل چکی تھی اور اس کے اندر لٹکے مختلف ادوار کے کپڑے اس کی ہستی کو لوگوں کے سامنے عریاں کر رہے تھے۔ وہ ڈھانپے رکھنے کی عادی تھی اس کے جاتے ہی سب دروازے کھل رہے تھے۔ اس کے آنسو جذب کئے قالین پر لوگ گندے پیروں سے آجا رہے تھے۔ سرخ کپڑوں کی تپش افسوس کے لئے بیٹھنے والوں کو جھلسا رہی تھی۔ کوئی اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر آگ تو اندھی ہوتی ہے، نہ پتہ پوچھتی ہے نہ مقصد بس جدھر راہ بنے ادھر کو چل پڑتی ہے۔ اس کے کپڑوں سے اٹھنے والی اس کے گم شدہ خوابوں کی آگ لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ زندگی میں کھائے جانے والے دھوکے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کر رہے تھے۔ ہر وقت امید کی باتیں کرنے والے لوگ بھی حیرانی سے اپنی آنکھوں میں اکٹھے ہونے والے مایوسی کے دھوئیں کو زور زور سے ہتھیلیوں سے رگڑ رہے تھے۔

کمرے میں پڑی مرحومہ کی کتابوں کی شیلف میں، ان تمام کتابوں پر کہیں سے کالی دھول آ کر چمٹی بیٹھی تھی۔ اس میں مرنے والی کی بچیوں کی کتابیں نہیں بلکہ اس کی اپنی تھیں اور وہ سب دھول زدہ کتابیں کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں جلن کے ساتھ ساتھ سوزش پیدا کر رہی تھیں۔ کتابوں کی شیلف سے اٹھنے والی دھول ان بند کتابوں سے خارج ہو رہی تھی، جسے کبھی مرنے والی یوں پڑھتی تھی جیسے انہیں پڑھنے کے بعد وہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کی سیڑھیاں پلک جھپکتے ہی طے کر لے گی۔ ان کتابوں میں وہ دن بند تھے جب وہ کنواری لڑکی تھی اور کالج کی سیڑھیاں پھلانگتی اور سٹیج پر چڑھ کر کبھی تقریریں کیا کرتی اور کبھی گانے گایا کرتی تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ نرالا کرنے کی دھمک ابھی بھی کتابوں سے نکل رہی تھی۔ شور پیدا ہوا تو کمرے میں موجود لوگوں نے اپنی اپنی کتاب ایک دوسرے سے چھپا لی، مگر مرنے والی چلی گئی تھی اس لئے اس کی کتابوں کا شور کسی سے نہ روکا

گیا۔ کمرہ آہوں اور سسکیوں سے گونجنے لگا، ماتم کی آوازیں دل کو دہلانے لگیں۔ کتابوں نے چپ نہ رہنے کی ٹھان رکھی تھی، وہ بولتی گئیں اور افسوس کرنے والے رو رو کے بدحال ہوتے گئے۔ اس کی کتابوں کے شیلف سے دھیان ہٹانے کو کچھ سمجھدار لوگوں نے اس کی بچیوں کی کتابوں کی شیلف کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ کتابیں ابھی نامکمل سی پڑی تھیں، ان میں خواب اِدھر اُدھر اُلٹے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ بچیوں کے قہقہے اور ننھی ننھی خوشیاں جو ماں کے ساتھ سے جڑی ہوئی تھیں بڑی لاپرواہی سے ان کتابوں سے جھانک رہی تھیں۔ یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اور مرنے والی کی پیچھے رہ جانے والی بچیوں کی کتابوں کی شیلف سے نکلنے والی ہنسی بھی لوگوں کو ماتم کرنے پر مجبور کرنے لگی کیونکہ سب جانتے تھے کہ اب اس شیلف میں وقت سے پہلے ہی خوابوں کے ٹوٹنے اور چھوٹے چھوٹے دھوکوں سے نبٹنے کی کتابیں بھرنے والی ہیں۔ اس شیلف میں مرنے والی کے اپنے لئے نہیں، اپنی بچیوں کے لئے دیکھے گئے خوابوں کی کتاب بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔ وہ خواب جو اس نے اس گھر کی تعمیر کے ساتھ ہی دیکھ لئے تھے جب اس کے اپنے خواب گھر کی بنیادوں کے ساتھ بہت گہرائی میں اتر گئے تھے۔

کتابوں اور گلاسوں پر پائے جانے والے اس کی انگلیوں کے نشان اس کے مرنے کے بعد زیادہ گہرے ہو گئے ہیں۔ افسوس کے لئے آنے والے اس جواں سال موت کی وجہ سے جھلاہٹ کا شکار ہو کر اپنے اپنے خوابوں کو اپنے ناخنوں سے کھرچنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ مرنے والی کو ناخنوں سے کسی بھی سطح کو کھرچنے سے بہت چڑ تھی اس لئے اس کی الماری میں لٹکے آخری دور کے سفید کپڑوں میں ہل چل ہو رہی ہے۔ مرنے سے ایک دو سال پہلے ہی اس کا پسندیدہ رنگ سفید ہو گیا تھا۔ کہاں سرخ اور کہاں سفید۔

ہینگر میں لٹکا سفید فراک جس کے کناروں پر چاندی رنگ کا ربن لگا ہوا ہے جو صرف چمکتا ہے تو نظر آتا ہے ورنہ تو بے جان سفید جیسا ہی ہے۔ مرنے والی کے سفید کفن

کے اوپر سرخ دوپٹہ ڈال دیا گیا تھا۔ مگر اس کی الماری کے ہینگرز سے ابھی تک سفید لباس چمک رہا تھا۔ جو اس کے زندگی کے اس دور کا حال سنا رہا تھا جب اس کی مایوسی نے درویشی اوڑھ لی تھی۔ جب اس نے لڑنا چھوڑ کر بس بات بے بات رونا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ آخر کار سمجھ گئی تھی کہ نہ یہ دنیا اس کی مٹھی میں آسکتی ہے اور نہ یہ دنیا اسے اسی حالت میں اپنا سکتی ہے۔ اس کا اور دنیا کا جو پہلے دن سے ٹکراؤ تھا، ختم ہو گیا تھا اور اس نے سفید رنگ پہن کر اس طاقتور دنیا کے آگے گھٹنے ٹیک دئے تھے۔ اب اس کی آنکھیں غصے سے سرخ نہیں بلکہ سفید پڑ جاتی تھیں۔ وہ سچ بات کہہ کے پریشان ہو جاتی تھی، جیسے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ اسے لگتا تھا اس کے سرخ رنگ کے دنوں کے جلال کا سب قصور ہے۔ سفید رنگ اوڑھ کر اسے لگا جیسے صرف وہ قصوروار تھی۔ اس کی آنکھوں میں جتنے بھی خواب ٹوٹے، روح پر جتنے بھی چھوٹے بڑے دھوکے ٹھہرے، وہ سب اس کا اپنا ہی قصور تھا۔

سفید دور کی بُردباری اس کے لباس سے نکل کر اسکی پیچھے رہ جانے والی معصوم بیٹیوں کے چہروں پر چمک رہی تھی۔ کیونکہ ان کی ماں زندگی کے ہینگر میں لٹکے کالے، لال سب دور زندگی میں ہی اپنے اندر اتار چکی تھی۔ سفید رنگ اوڑھ کر جب وہ قبر کی طرف جا رہی تھی تو موت کے بعد پیچھے رہ جانے والے تنہا گھر کی دیواروں کو بھی سمجھداری اور برداشت کا سفید رنگ اوڑھا گئی تھی۔ افسوس کے لئے آنے والوں کی رو رو کر جب آنکھیں سفید ہونے لگیں تو کسی نے الماری کے اندر سے جھانکتے سبز شادی کے جوڑے کو دیکھ لیا۔۔ اور اس کے سفید کفن کے اوپر سرخ دوپٹہ ڈالنے پر اعتراض کرنے والے چپ کر کے، مرحومہ کے سبز رنگ کے شادی کے جوڑے کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ جو دلہنیں ضد کر کے شادی والے دن سرخ جوڑا نہیں پہنتیں، انہیں جلد ہی، بڑھاپا آنے سے بہت پہلے ہی کفن کے اوپر سرخ دوپٹہ اوڑھنا پڑتا ہے۔

بدرنگ صوفہ

تم کون ہو؟

میں؟۔۔ میں نگہت، کیا آپ مجھے نہیں جانتے؟۔۔ میں نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھتے ہوئے سوال پر سوال کر دیا۔

نام تو میں جانتا ہوں اور بہت سے لوگ بھی جانتے ہونگے، مگر جو تُم بھی نہیں جانتی اس کے جواب کی تلاش ہے۔

میری آنکھوں میں ابھی بھی حیرت تھی۔

سوچو، اسی حیرت سے سوچو، اسی تجسس سے سوچو، محنت سے سوچو، بُوجھو کہ تم کون ہو؟ اس نام کے علاوہ کون ہو۔۔

میں جو اپنے آپ کو بہت زیادہ" جاننے والی" سمجھتی تھی، اس انکشاف پر حیران رہ گئی کہ میں اپنے آپ کو ہی نہیں جانتی تھی۔

کینیڈا کے الیکشن میں کیا ہوگا؟ امریکہ کے چھوٹے ممالک پر مظالم کی وجوہات کیا ہیں؟ پاکستان میں جمہوریت کیوں نہیں پنپتی؟ تھرڈ ورلڈ ممالک کا المیہ کیا ہے؟ کیا سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا کے امن کو چاٹ لیا ہے یا نظریوں نے انسان کو مات دے دی ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب دینے میں، مجھے سوچنے کو ایک پل بھی نہیں چاہیئے تھا، مگر میں کون ہوں؟ اس کا جواب اتنا مشکل ہوگا کہ میرا جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جائے گا اور میری

ہڈیوں میں زمانے بولنے لگ جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔۔۔۔۔۔

یہ سوال آج بھی جواب کی تلاش میں میرے ساتھ اس کمرے میں لیٹا ہوا ہے، آج جب کہ میں گھر سے کوسوں دور ہوں اور سوچ رہی ہوں یہ اجنبی کمرہ جس کے اندر ایک اجنبی بیڈ پڑا ہے، اور سائیڈ پر ایک اجنبی صوفہ دھرا ہے۔ کیا ان سے کبھی کسی نے پوچھا ہوگا کہ تم کون ہو؟

لیمپ کی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی ہے اور میں آئینے میں دیکھتی ہوں کہ شائد،تم کون ہو؟ کا جواب وہیں کہیں دھرا ہو۔۔۔۔

آئینے سے جواب نہ ملا تو میں اُس بدرنگ صوفے پر جا بیٹھی، نجانے کیوں آئینے میں اپنے عکس سے اتنی انسیت محسوس نہیں ہوئی جتنی اس صوفے سے ہو رہی ہے۔

جانتی ہوں، اس پر میرا کوئی حق نہیں، کل ہوٹل کے اس کمرے میں کوئی اور آ کر ٹھہرا ہوگا اور یہ اسکے استعمال میں بھی ہنسی خوشی آتا ہوگا، اس نے کب کسی کو اچھا یا برا کہہ کر گلے سے لگایا یا دھتکارا ہوگا۔ جو کمرے کی قیمت ادا کرتا ہے اس، قیمت میں کچھ حصہ اس صوفے کا بھی ہوتا ہوگا، اسی قیمت کے بدلے کوئی بھی اس پر آ کر بیٹھ آ سکتا ہے، لیٹ سکتا ہے اور اپنے جسم سے نکلے تفریحی لمحات کے قطرے پھینک سکتا ہے۔ یہ کس کو روکتا ہے یا کس کو پاس بلاتا ہے۔ اس کا کون ہے، اسے سب ادھورا چھوڑ جاتے ہیں، اسے کون کہہ کر جاتا ہے کہ تمھارے بغیر اب رہنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کو آنے کے بعد اور جانے سے پہلے کون پوچھتا ہے کہ تمھارا حال کیا ہے؟

میں اس صوفے پر جس کا رنگ کبھی بڑا خوبصورت نیلا رہا ہوگا بیٹھی ہوں۔ اپنے بچوں سے، اپنے اس گھر سے، جسے میں نے بڑی محنت سے بنایا تھا، کوسوں دور بیٹھی ہوں اور سوچ رہی ہوں کبھی میرا رنگ بھی بڑا پیارا نیلا تھا مگر اب اس صوفے کی طرح میرا رنگ

جگہ جگہ سے اتر چکا ہے۔ میں نے صوفے کو جھاڑا، ایک دم سے مجھ پر پڑی زمانوں کی دھول اڑنے لگی۔ صوفے کا مسخ شدہ چہرہ تو سب کو نظر آ رہا تھا، مگر روح میں اتری تھکاوٹ کسی کو نظر نہیں آتی تھی اور ہاں کوئی جھاڑ کے دیکھے تو دھول سے کمرہ بھرنے لگتا ہے۔ میں نے زور سے صوفے کو اپنے ساتھ بھینچ کر لگا لیا، یہ تو بالکل میرے جیسا ہے، میرے آئینے میں نظر آنے والے عکس سے بھی کہیں زیادہ میرے جیسا۔

کمرے میں اڑتی گرد میں مجھے نظر آیا جب میں بارہ سال کی تھی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے گھر کے صحن میں کھیل رہی تھی۔ اس صحن کے چاروں طرف کمرے تھے، سب کے دروازے صحن میں کھلتے تھے اور صحن کے منہ پر ایک دروازہ تھا جو باہر گلی میں کھلتا تھا، یہ دروازہ اکثر بند رہتا تھا، کھلا بھی ہوتا تو اس کے اوپر جھولتا ہوا لمبا ٹاٹ کا پردہ اس صحن کی دنیا کو دروازے کے دوسری طرف کھلنے والی دنیا سے الگ رکھتا تھا۔ سارے محلے کی لڑکیاں ہمارے صحن میں کئی سالوں سے کھیلنے آتی تھیں، اور اب سب بچپن کی سپاٹ اور لاپرواہ زندگی سے نوجوانی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے ہم پردے کے دوسری طرف والی دنیا میں آزادنہ آ جا سکتی تھیں مگر اب جب کچھ اعضاء جسم سے الگ ہو کر ایک علیحدہ ہی منظر نامہ دکھانے لگے تھے، تو پردے سے اُدھر کی دنیا ہم سے دور ہو رہی تھی اور ایسے میں ہم لڑکیاں چونکنے کے مراحل میں داخل ہو چکی تھیں اور تجربہ کار عورتیں نصیحتوں اور عبرت کی کہانیوں کی پوٹلیاں اٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے گھومتی رہتی تھیں۔

میرا اپنا جسم بھی کھل رہا تھا جو مجھے درد اور دوسروں کو راحت دینے لگا تھا، میں باہر جاتی تو ان آدمیوں کی نظریں کاٹنے لگی تھیں جن کی گودوں میں، مَیں نے کھیل کر بچپن گذرا تھا، اب وہ چھونے کی کوشش کرتے تو مجھے خود بخود شرمندگی ہونے لگتی تھی، مگر ان کے چہروں پر عجیب سی لذت کا رنگ ہوتا تھا۔ عجیب دن تھے نہ گھر کے اندر چین نہ باہر سکون، صحن کی دنیا